بے نظیر بھٹو......اِک ادھوری کہانی

الجزائر کے دارالحکومت الجیرز (Algiers) کے ہواری بومدین بین الاقوامی ہوائی مستقر پر پاکستانی فضائیہ کا وی آئی پی طیارہ تزک واحتشام کے ساتھ اترا۔ الجزائر کی فضائی حدود میں داخلے کے بعد سے الجزائری فضائیہ کے لڑاکا طیاروں نے اسے بہ حفاظت وسلامتی ہوائی اڈے تک پہنچانے کا خوشگوار فریضہ سرانجام دیا تھا۔

حسب پروٹوکول میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا طیارہ میں سب سے پہلے داخل ہوا۔ میرے دوست اسکوڈرن لیڈر ارشد سمیع نے، جن کے سپوت عدنان سمیع نے بعد میں بے انتہا نام کما کر باپ کے نام کو امر کر دیا، طیارہ کے دروازے پر میرے کان میں سرگوشی کی: ''وزیراعظم اپنے کیبن میں تیار ہو رہی ہیں۔ انہیں دو چار منٹ دیجیے''۔

میں نے وہ دو چار منٹ وزیراعظم کے ہمراہ آنے والے وزراء اور اپنے دفتر خارجہ اور وزارت اطلاعات کے دوستوں کو خوش آمدید کہنے میں صرف کیے اور جب ارشد سمیع نے جو بحیثیت چیف آف پروٹوکول وزیراعظم کے ہمراہ آئے تھے، مجھے اشارہ کیا کہ اب وزیراعظم اور ان کے شوہر نامدار دونوں تیار ہیں تو میں متانت کے ساتھ وی آئی پی کیبن میں داخل ہوا جہاں وزیراعظم بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری تیار کھڑے تھے۔

میں نے مناسب الفاظ میں دونوں کا استقبال کرنے کے بعد درخواست کی کہ وہ نیچے تشریف لے چلیں کیونکہ الجزائر کے وزیراعظم مولود حمروش صاحب ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے جہاز کی سیڑھیوں پر ان کے منتظر تھے۔ بے نظیر بھٹو نے میری درخواست پر ذرا تنک کر کہا: ''آپ راستہ دیں تو ہم باہر نکلیں''۔

میں نے چونک کر اپنے دائیں بائیں دونوں طرف دیکھا کہ کیا میں واقعی ان کی راہ میں حائل تھا لیکن میں تو کیبن کے دروازے کے صرف ایک کونے میں کھڑا تھا اور وی آئی پی کیبن کا سلائیڈ ہونے والا دروازہ پورے کا پورا کھلا ہوا تھا۔

بے نظیر بھٹو سے یہ میرا پہلا تعارف تھا لیکن ان کا وہ جملہ کہ میں ان کا راستہ روکے ہوئے تھا یا ان کی راہ میں حائل تھا، میرے لیے ان کی اس وقت تک کی گزری ہوئی حیات کا نچوڑ تھا۔ ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں بے نظیر پر ہر ممکن دروازہ بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور قید و بند کی جن صعوبتوں سے انہیں گزرنا پڑا تھا، انہوں نے بے نظیر کی نفسیات پر گہرے نقوش مرتسم کیے تھے۔ ایک بے نام سا خوف

اور ہراس تھا جو لاشعوری طور پران کی نفسیات کا حصہ بن چکا تھا۔ یہ خوف، یہ وسوسہ اور اندیشہ کہ کوئی ان کا راستہ مسدود کیے ہوئے تھا یا مسدود کرنے کی کوشش کر رہا تھا ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔

لیکن اس روز الجزائر کے خوبصورت دارالحکومت میں تو ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا جو ان کا راستہ روکنا چاہ رہا ہو۔ وہاں تو حکومت کے اعلیٰ ترین عمال سے لے کر ایک عام الجزائری تک سب ہی ان کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے کھڑے تھے۔ میں نے دو سال میں پہلی مرتبہ وہاں یہ نقشہ دیکھا تھا کہ ہوائی اڈے سے شہر تک کے طویل راستے پر دونوں طرف عوام جن میں عورتیں اور بچے خاص طور پر نمایاں تھے، برادر ملک پاکستان سے آنے والی خاتون رہنما کے لیے ہمہ تن انتظار بنے کھڑے تھے۔

الجیرز میں بے نظیر کا استقبال بلا مبالغہ والہانہ اور انتہائی گرمجوشی کا حامل تھا اور اس کی دو وجوہات تھیں: پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی تھیں۔ محض بیٹی ہی نہیں بلکہ ان کی سیاسی وارث اور جانشین بھی، اور الجزائر کے سوشلسٹ سیاسی کلچر میں زلفی بھٹو کا بڑا نام تھا۔ ان کی بے انتہا قدر و منزلت تھی جو اس سبب سے اور بھی زیادہ تھی کہ وہ الجزائر کے آنجہانی صدر ہواری بومدین جن سے الجیرز کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ معنون ہے، کے بہت عزیز اور قریبی دوست سمجھے جاتے تھے۔ الجزائر نے سامراج کے خلاف آٹھ برس کی طویل جدوجہد آزادی کی قیمت پندرہ لاکھ قیمتی جانوں کے ضیاع کی صورت میں ادا کی تھی، لہٰذا نہ صرف فرانسیسی استعمار کے خلاف اس حریت پسند قوم میں شدید قسم کی جذباتی مزاحمت تھی بلکہ پورے مغرب اور اس کے بنیادی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف الجزائری قوم دنیا کی دیگر مغلوب اور مظلوم اقوام کی صف میں ان کے شانہ بشانہ کھڑی تھی۔ حواری بومدین نے ۱۹۶۲ء کی الجزائری آزادی اور خود مختاری کے صرف تین برس بعد جنگِ آزادی کے نامور ہیرو کی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر جنگ آزادی کے سب سے نامور بطل جلیل اور آزاد الجزائر کے پہلے صدر احمد بن بیلا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور پھر ۱۹۷۹ء میں اپنی موت تک وہ الجزائر کے بلاشرکت غیرے حکمراں رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو سے ان کی نظریاتی قربت تھی اور بھٹو نے ۱۹۷۴ء میں لاہور میں جو اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کی تھی، اس میں بومدین اور لیبیا کے نوجوان اور شعلہ صفت معمر قذافی ان کے ساتھ ہر جگہ نمایاں نظر آتے تھے۔

لیکن بے نظیر کے لیے الجزائری دلوں میں نرم گوشہ اس لیے بھی تھا کہ وہ عالمِ اسلام کی پہلی خاتون وزیراعظم اور رہنما تھیں۔ الجزائریوں کے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی کہ ایک ایسے مسلم معاشرے میں جہاں عورت پر مذہب اور دقیانوسی قبائلی اور جاگیردارانہ رسوم و رواج نے قدم قدم پر پہرے لگا رکھے تھے، پینتیس برس کی ایک خوبصورت پڑھی لکھی اور مغربی علوم اور مغربی جامعات سے بہرہ یاب نوجوان خاتون اس ملک کی سیاست اور ریاستی اقتدار کی اعلیٰ ترین مسند پر فائز ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

الجزائر کی حکومت اور عوام نے بے نظیر کے لیے اپنے دل کھول دیئے تھے۔ مجھے اس وقت تک یعنی جولائی ۱۹۹۰ء میں الجزائر میں سفارت کی ذمہ داری نبا ہتے ہوئے دو برس ہو چکے تھے لیکن اس عرصہ میں، میں نے کسی اور سربراہ مملکت یا حکومت کے لیے الجزائر کی حکومت کو یوں والہانہ طور پر استقبال کرتے نہیں دیکھا تھا اور عوامی جوش وخروش کا تو کہنا ہی اور تھا۔

مجھے یاد ہے کہ دو برس پہلے جب بے نظیر اپنے خلاف صف آراء بے شمار مخالفتوں اور دشمنیوں کی خاردار باڑھ کو پھلانگنے کے بعد روشن اور شفاف جمہوری عمل کے نتیجے میں پاکستان کی وزیر اعظم بننے میں کامیاب ہوئی تھیں تو میرے پاس سفارت خانے میں الجزائری عوام اور خواص دونوں کی طرف سے آنے والے مبارکبادی خطوط اور پیغاماتِ تہنیت کی جیسے ایک لائن لگ گئی تھی۔ ان پیغامات میں خواتین کی طرف سے آنے والے خطوط کی تعداد مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی اور ہر مکتوب سے والہانہ مسرت اور عقیدت کی جیسی سیکڑوں پھلجھڑیاں روشن ہو رہی تھیں۔ اس اظہارِ اطمینان کے ساتھ کہ بے نظیر نے ایک مردانہ Chauvinist معاشرہ کو اپنی لیاقت اور استعداد سے مات کر دیا تھا۔

وزیر اعظم، ان کے شوہر نامدار اور ان کے ذاتی اور سکیورٹی کے عملے کو وسطِ شہر میں واقع ایک بہت ہی خصوصی سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا جبکہ وزراء اور مشیروں کے لشکر کو وہاں سے ذرا دور الجیرز کے جدید اور بہت ہی آرام دہ گیسٹ ہاؤس میں فروکش کیا گیا تھا لیکن بے نظیر کے ہمراہ آنے والے سرکاری افسران اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو جن کی تعداد بھی کسی لشکر سے کم نہیں تھی، وہاں سے کافی دور ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں اقامت پذیر ہونے کی زحمت دی گئی تھی۔

یہ سب خواتین وحضرات تو بہت اطمینان سے اپنے اپنے عارضی ٹھکانوں میں آباد ہو گئے لیکن اقامت گاہوں کی اس تقسیم نے مجھے اور میرے محدود عملے کو جیسے سلاخوں پر ٹانگ دیا کہ اس کی ایک ٹانگ ایک طرف جھول رہی تھی تو دوسری ٹانگ کسی اور سمت میں بھگا رہی تھی۔

میرا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس سفارتخانے میں لے دے کے صرف ایک ماتحت سفارتی افسر تھا اور وہ بھی اپنی پہلی تعیناتی پر وہاں آیا تھا اور پاکستانی اور الجزائری دونوں اقسام کے ماتحت عملے کو ملا کر بمشکل دس افراد بھی نہیں بنتے تھے۔ تینوں الجزائری لڑکیاں بھی جو سفارت خانے میں ترجمان کا کام کرتی تھیں، بیچاری ہمہ تن خدمت میں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ان تینوں میں سے ایک ایک کو تینوں اقامت گاہوں میں بٹھا دیا تھا تا کہ وہاں ترجمانی کرتی رہیں۔ ستم بلائے ستم یہ تھا کہ الجزائر میں یا تو فرانسیسی بولی جاتی تھی یا فرانسیسی آمیز عربی اور وزیر اعظم کے ہمراہ آنے والوں میں سوائے صاحبزادہ یعقوب خاں کے اور کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ ان زبانوں کو سمجھتا ہو۔

اپنی افرادی قلت سے مجبور ہو کر میں نے تو اس واحد پاکستانی پروفیسر کو بھی لائن حاضر کر لیا تھا جو الجیرز سے دو ڈھائی سو کلومیٹر دور باتنا یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ وہ شریف آدمی میرے ایک فون پر وہاں سے دوڑا چلا آیا تھا لیکن وزیراعظم کے ہمراہ آنے والے جم غفیر کو ان نزاکتوں اور مجبوریوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔

مزے کی بات یہ تھی کہ نہ بے نظیر نے کوئی غیر معمولی فرمائش کی نہ آصف علی زرداری نے۔ زرداری صاحب تو اپنے سویٹ (Suite) میں اپنے ایک یارِ غار کے ساتھ، جن کا تعلق کراچی سے تھا، اور نام اگر میری یادداشت دھوکہ نہیں دیتی تو جاوید تھا، فروکش ہو کر بالکل ہی بے نیاز ہو گئے تھے۔ انہوں نے بس ایک فرمائش کی تھی اور وہ بھی میری بیوی سے کہ انہیں گھر کا پکا ہوا کھانا اگر فراہم کر دیا جائے تو بڑی عنایت ہوگی اور دوسرے یہ کہ انہیں اگر ہندوستانی فلموں کے کیسٹ بھی بھجوا دیئے جائیں تو فبہا...... سونے پر سہاگہ ہوگا......اور ان کی یہ فرمائش میری بیوی اور باورچی نے بسر و چشم قبول کر لی تھی۔

وزیراعظم کے ذاتی عملے میں بھی فوں فاں کرنے والے کم ہی تھے، سوائے ناہید خان کے جن کا رویّہ اور سلوک بشمول میرے، ہر ایک کے ساتھ تہذیب کی عدم موجودگی کا برملا اور واشگاف اعلان کر رہا تھا۔ مجھ سے تو خیر انہوں نے زیادہ بھڑنے کی کوشش نہیں کی۔ جو ان کے اور میرے دونوں کے حق میں بہتر ہوا لیکن اس غریب پروفیسر ڈوگر سے جو محض پاکستان کی محبت میں بیگار کر رہا تھا، ان کا سلوک سخت نازیبا تھا جس پر ڈوگر صاحب نے مجھ سے احتجاج بھی کیا اور میں نے ان سے معذرت کی کہ میری خاطر وہ ایک ایسی خاتون کے عتاب کا شکار ہو رہے تھے جس کا کوئی سرکاری منصب نہیں تھا۔

مجھے ان تین دن کے دوران کچھ ہلکا سا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ زرداری صاحب ناہید خان کی جارحانہ روش پر خوش نہیں تھے اور خوش ہونے والی کوئی بات بھی نہیں تھی کیونکہ ناہید خان یوں لگتا تھا جیسے بزعم خود بے نظیر اور بقیہ دنیا کے بیچوں بیچ سدِّ سکندری یا ایک جدید دیوارِ چین بننے کی جستجو کر رہی تھیں اور اس قسم کا رویہ، دخل در معقولات ہونے کی صریحاً کوشش، کم ہی لوگ قبول کر سکتے تھے۔ زرداری نے بے نظیر کی دلخراش رحلت کے بعد ناہید خان کو پارٹی کے امور سے یوں الگ کیا جیسے دودھ میں سے مکھی کو نکال کر پھینک دیا جائے۔ اس پر بہت سے لوگوں کو سخت حیرت ہوئی اور کچھ کو اعتراض بھی لیکن میں نے الجیرز کی ان یادوں کو جب کھنگالا تو میری سمجھ میں زرداری کے اس اقدام کی وجہ بخوبی آ گئی۔

لیکن میرے لیے اصل دردِ سر ناہید خان نہیں تھیں بلکہ وہ وزراء اور مشیر تھے جو وزیراعظم کے ہمرکاب تھے اور جن میں سے اکثر اپنے آپ کو اگر وزیراعظم نہیں سمجھتے تھے تو بھی ان کے رویّہ سے یوں لگتا تھا جیسے وہ بادلوں میں رہتے ہوں اور ان کی دانست میں زمین کا مرکزِ ثقل ان کے قدموں تلے تھا، لہٰذا

ان کی نظر میں کیا سفیر اور کیا سفیر کی معاونت کرنے والے محنت کش کارکنان، سب ہی زمین پر رینگنے والے کیڑے تھے جنہیں پاؤں تلے کچل دینا ان کی شریعت میں عین مباح تھا۔

وزراء اور مشیر تو مجھ سے اس لمحہ سے نالاں ہو گئے تھے جب میں نے جہاز کے اندر ان سب کو فرداً فرداً خوش آمدید کہا تھا۔ اس مختصر وقفے میں جب میں منتظر تھا کہ وزیراعظم کے خصوصی کیبن کا دروازہ کھلے اور میں انہیں بھی خوش آمدید کہوں۔ وزراء اور مشیران مجھ سے فوری طور پر یہ فرمائش کر چکے تھے کہ میں تین دن کے دورے کو مختصر کر کے دو دن کا کروادوں تاکہ تیسرا دن وہ جنیوا میں سیر سپاٹے اور شاپنگ میں گزار سکیں۔

مجھے ان کی فرمائش پر حیرت بالکل نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ وہ وزیراعظم کی ہمراہی کا فائدہ اٹھا کر سیر تفریح اور شاپنگ کے ارادہ سے ہی نکلے تھے لیکن افسوس بھی ہوا کہ یہ چھٹ بھیئے جنہیں قوم کی رہنمائی کا زعم تھا اور جو اپنے آپ کو عوامی جلسوں اور ایسے ہی دوسرے اجتماعات میں قوم کا خادم کہتے نہیں تھکتے تھے اتنے بے حس تھے کہ انہیں ملک کی عزت اور وقار کا شمّہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔

مجھے احساس تھا اپنے فرائض کا بھی اور ملک کی عزت اور ناموس کا بھی، لہٰذا میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں اس فرمائش کو پورا کرنے سے قاصر رہوں گا۔ بھلا کوئی ہنسی کھیل تھا کہ میں میزبان ملک کے عمائدین سے جنہوں نے عرق ریزی کے بعد تین دن کا پروگرام مرتب کیا تھا، یہ بے ہودہ فرمائش کرتا کہ وہ دورے کے پروگرام کو مختصر کر دیں۔ اس لیے کہ ہمارے اوچھے اور چھچھورے وزراء سوئٹزر لینڈ میں سیر و تفریح کرنا چاہتے تھے۔

حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے پہلی فرصت میں وزیرخارجہ صاحبزادہ یعقوب خان سے جو وزیراعظم کے ہمراہ تھے اور میں جانتا تھا کہ ان چھٹ بھیئے وزراء سے مختلف دل و دماغ کے مہذب اور نستعلیق انسان تھے، اس معاملہ کا ذکر کر دیا اور انہیں بتلا دیا کہ دورہ کو مختصر کرنے کا کیسا منفی اور مضر نتیجہ ہوگا۔ صاحبزادہ صاحب ظاہر ہے کہ دنیا دیکھے ہوئے تجربہ کار اور صاحب فراست انسان تھے، انہوں نے میری پیٹھ ٹھونکی۔ کہا کہ میں نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ سو فیصد درست ہے اور وعدہ کیا کہ وہ وزیراعظم کو اس سے آگاہ کر دیں گے۔ صاحبزادہ صاحب نے یقیناً ایسا ہی کیا ہوگا۔ اس لیے کہ بے نظیر نے جب میں انہیں ان کے دورہ کے پروگرام کی تفصیل بتا رہا تھا، مجھ سے پورا اتفاق کیا کہ جو بھی پروگرام ترتیب دیا گیا تھا، اہم تھا اور وہ اس سے پوری طرح مطمئن تھیں لیکن وزراء اپنے دلوں میں میری طرف سے گرہ باندھ چکے تھے اور ان کی نظر میں بال آ گیا تھا۔

مجھے لگا جیسے اپنے قبیلے کی نمائندگی اور ترجمانی کرنے کا فریضہ سرجن نصیر شیخ نے اپنا لیا تھا کیونکہ ان حضرت نے پہلی ہی شام سے جب بے نظیر اور ان کے وفد کے اعزاز میں الجزائر کے وزیراعظم

مولود حمروش نے پرتپاک عشائیہ دیا، میرے خلاف زبانی حملوں کا آغاز کر دیا تھا۔

میں نصیر شیخ سے اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ ہاں ان کی صورت کا آشنا ضرور تھا اور وہ بھی اس حوالے سے کہ وہ پی ٹی وی پر حفظانِ صحت سے متعلق ایک پروگرام کیا کرتے تھے جسے میں بھی کبھی کبھار دیکھا کرتا تھا۔ اس پروگرام کی ترتیب میں بھی ان کا جوانداز تھا، اس سے مجھے یہ تو احساس ہو گیا تھا کہ یہ شخص اپنی محبت میں گرفتار اور انا کا مارا مریض ہے لیکن ان کے جو رنگ ڈھنگ میں نے ان تین دنوں میں الجیرز میں دیکھے، اس سے میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ بے نظیر کے گرد حلقہ تنگ کرنے والے موقع پرستوں میں سے زیادہ تر انا پرست، نیچ ذہنیت کے مالک اور کم ظرف لوگ تھے۔

وزیراعظم حمروش کے عشائیہ میں صرف ایک ہیڈ ٹیبل لگائی گئی تھی جس پر دونوں وزرائے اعظم بیٹھے تھے اور دونوں طرف کے وزراء اور یہ خاکسار الجزائر میں پاکستان کا سفیر ہونے کی حیثیت سے وہاں بٹھایا گیا تھا۔ بقیہ ارکانِ وفد جن میں سرجن نصیر شیخ اور دوسرے مشیر بھی شامل تھے، سامنے گول میزوں کے گرد بٹھائے گئے تھے۔ اتفاق یہ ہوا کہ وہ گول میز جس پر سرجن نصیر شیخ کو بٹھایا گیا تھا، بالکل میرے سامنے تھی لیکن ظاہر ہے کہ میں وقتی طور پر بلند مقام پر تھا اور وہ نیچے۔

اس میز پر ان کے ہمراہ اور بھی پاکستانی اور الجزائری معززین تھے جن میں ایک ہمارے اس وقت کے سکریٹری خارجہ تنویر احمد صاحب بھی تھے۔ تنویر صاحب سے میری بے تکلفی بھی تھی اور دوستی بھی۔ وہ دفتر خارجہ میں میرے براہِ راست باس رہے تھے۔ جب میں ڈائریکٹر جنرل تھا اور وہ اضافی یا اصطلاحِ سرکار میں ایڈیشنل سیکرٹری تھے۔

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ نصیر شیخ صاحب اپنی نشست پر بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ چہرے پر ان کے ناگواری کے اثرات تھے۔ کبیدہ خاطری ٹپکے پڑ رہی تھی اور اسی عالم میں وہ مجھے بار بار کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ تنویر صاحب جو ان کی بغل میں ہی بیٹھے تھے، وہ بھی ان کی بے چینی کو محسوس کر رہے تھے اور جب بھی موقع ملتا تھا، شرارت سے ان کی طرف اشارہ کر کے مجھے ان کی حالتِ زار کی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ ایک دو بار نصیر شیخ صاحب نے بھی دیکھ لیا کہ تنویر صاحب اور مجھ میں اشاروں کی زبان میں گفتگو ہو رہی تھی۔

عشائیہ جیسے ہی ختم ہوا نصیر شیخ تیر کی طرح میری طرف آئے اور بڑے طنزیہ لہجے میں فرمایا:

''آپ اور تنویر صاحب کچھ میرے متعلق اشارے کر رہے تھے؟''

میں نے عرض کیا: ''جناب والا تنویر صاحب اور میں ایک ہی سروس سے ہیں اور پرانے رفیق ہیں اور ہمارے پاس گفتگو کرنے کے لیے بے شمار موضوعات ہیں۔ یقین کیجیے آپ ہمارا موضوعِ سخن نہیں تھے''۔

میرے جواب نے سرجن صاحب کو جیسے اور زیادہ زچ کر دیا تھا، لہٰذا وہ اور بھی ناگوار لہجہ میں ذرا ترُش کر بولے: ''اچھا یہ بتائیے کہ آپ ہیڈ ٹیبل پر کیوں بیٹھے تھے اور میں نیچے کیوں تھا؟ میرا رتبہ تو آپ سے بلند ہے۔ میں آخر کو وزیرِ اعظم کا مشیر ہوں جس کا رتبہ وفاقی وزیر کے مساوی ہے''۔

وہ شاید یہ چاہ رہے تھے کہ میں طیش میں آ جاؤں تا کہ وہ سب کے سامنے مجھے موردِ الزام ٹھہرا سکیں لیکن میں اس وقت تک اپنی سفارتی زندگی میں ان جیسے بہت سے فسادیوں کو جھیل چکا تھا، لہٰذا میں نے ماتھے پر کوئی شکن ڈالے بغیر جواب میں متانت سے کہا: ''آپ کا فرمانا بجا ہے۔ آپ رتبے میں مجھ سے بڑے ہیں لیکن یہاں پاکستان کا سفیر میں ہوں، آپ نہیں ہیں اور پروٹوکول ان حالات میں سفیر کا مقام مشیر یا وزیر کی سوچ سے الگ طے کرتا ہے۔ مجھے ہیڈ ٹیبل پر میری اسی حیثیت میں بٹھایا گیا تھا''۔

میرے اس دوٹوک یا شاید منہ توڑ جواب پر وہ بہت بھنّا کر الٹے قدموں بھیڑ میں گم ہو گئے۔

دوسری صبح وزیرِ اعظم بے نظیر کی اولین مصروفیت وسطِ شہر میں واقع اس عظیم الشان یادگار پر پھولوں کا ہار چڑھانے کی تھی جو الجزائر کی طویل اور خون آشام جنگِ آزادی میں شہید ہونے والے پندرہ لاکھ حریت پسندوں کی علامتی آرامگاہ ہے اور جس پر ہمہ وقت آزادی کا شعلہ منور رہتا ہے۔ وزیرِ اعظم کے ہمراہ ان کے وفد کے تمام افراد تھے لیکن آصف علی زرداری صاحب اور سرجن نصیر شیخ نہیں تھے بلکہ دونوں اصحاب اپنی عدم موجودگی کے سبب بہت نمایاں تھے۔

بے نظیر کو زرداری کے نہ ہونے کا تو بخوبی علم تھا لیکن نصیر شیخ کی بابت وہ ارشد سمیع سے استفسار کر رہی تھیں اور ارشد سمیع مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ مشیر بے مہار کہاں ہیں؟

میں نے انہیں بتایا کہ دن بھر کے پروگرام کی تحریری تفصیل کل شام کو ہی ہر کمرہ میں رکھ دی گئی تھی۔ نصیر شیخ صاحب اس کے باوجود وہاں کیوں نہیں تھے، اس کا رمز آشنا میں نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ آخرِ شب کے مشاغل نے صبح سویرے بیدار نہ ہونے دیا ہو۔ ان کے متعلق یہ قیاس کرنا تو ممکن نہیں تھا کہ ان کی شب بیداری میں عجز و انکسار یا زہد و تصوف کو دخل ہو۔

شہداء کی یادگار سے فراغت پاتے ہی وفد کے چیدہ چیدہ اراکین وزیرِ اعظم کی معیت میں صدر کے دفتر کی طرف روانہ ہوئے جہاں صدر شاذلی بن جدید اور بے نظیر کی باضابطہ ملاقات اور دونوں وفود کے درمیان سرکاری مذاکرات کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بے نظیر کو اس ملاقات کے لیے روانگی کے وقت بھی نصیر شیخ کی فکر تھی اور ارشد سمیع سے یہی سوال تھا کہ وہ ذاتِ شریف ہیں کہاں؟

کانفرنس روم میں بے نظیر کے پیچھے پیچھے سب اراکین باری باری داخل ہو رہے تھے اور اندر جاتے جاتے بھی بے نظیر نے مجھ سے تاکید کی کہ معلوم کروں نصیر شیخ صاحب کہاں رہ گئے تھے۔ میں منتظر تھا کہ

سب لوگ اندر چلے جائیں تو یہ فکر کروں کہ نصیر شیخ کو تلاش کہاں کیا جائے کہ اتنی دیر میں وہ ایک گاڑی سے لشتم پشتم برآمد ہوئے۔ غصہ سے لال بھبوکا ہو رہے تھے اور جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی، پھٹ پڑے۔ بہت طیش سے فرمایا: ''آپ کا انتظام یہ کیسا ہے؟ مجھے تو آج کے پروگرام کی کوئی خبر ہی نہیں تھی''۔

طیش تو مجھے بھی بہت آیا لیکن میں اپنے غصے کو پی گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ لاعلمی اور بے خبری کا سوانگ رچا رہے ہیں۔

میں نے جواب میں انہیں یاد دلایا کہ سفارتخانے کی طرف سے چھپا ہوا پروگرام ہر مہمان کے کمرہ میں مہیا کیا گیا ہے۔ انہوں نے اور زیادہ ترخ کے فرمایا کہ ان کے کمرہ میں انہیں ایسا کوئی کاغذ نہیں ملا۔

میں جانتا تھا کہ وہ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہے تھے۔ پھر بھی میں نے بحث کو مختصر کرنے کی نیت سے عرض کیا کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ وفد کے دوسرے تمام اراکین سوائے آصف علی زرداری کے روگرام کے مطابق وہاں موجود تھے۔

میرے جواب پر اور زیادہ سیخ پا ہو کر انہوں نے فرمایا: ''آپ میرے ساتھ نامناسب سلوک کر رہے ہیں۔ مجھے دانستہ نظر انداز یا جا رہا ہے۔ میرے مرتبے کے مطابق مجھ کو عزت نہیں دی جا رہی۔ میں اس کی شکایت وزیراعظم سے کروں گا''۔

ان کی گفتگو کے آخری جملے نے مجھے مجبور کیا کہ میں بھی ان سے دوٹوک بات کرلوں، لہٰذا میں نے اپنے لہجہ میں تلخی یا کڑواہٹ لائے بغیر ان سے مؤدبانہ کہا: ''آپ جو چاہیں کیجیے۔ شوق سے شکایت کیجیے۔ میرا نام تو آپ کو یاد ہوگا؟''

میرے اس جملے نے جلتی پر غالباً اور تیل چھڑک دیا۔ انہیں مجھ سے شاید اتنی صاف گوئی کی یا دیدہ دلیری کی امید نہیں تھی۔ ان کے وڈیرہ شاہی دماغ کی مخصوص ساخت نے تو ان کو یہ ڈھارس بندھائی ہوگی کہ وزیراعظم سے شکایت کرنے کی دھمکی کا سن کر یہ دو ٹکے کا سفیر کانپنے لگ جائے گا اور پیروں پر گر کر التجا کرے گا کہ اسے معاف کر دیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میری بے باکی نے تو ان کا کھیل ہی الٹ دیا تھا، لہٰذا وہ پیر پٹختے ہوئے اندر کانفرنس روم میں چلے گئے اور ان کے پیچھے پیچھے میں بھی۔

اس دوبدو کے بعد دورہ کے اختتام تک سرجن نصیر شیخ نے مجھ سے پھر بات نہیں کی۔ مجھے دیکھتے ہی ان کا منہ پھول جاتا جو میرے لیے تفریح کا سامان تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ اور بھی وزراء مجھ سے اس وجہ سے برہم رہے کہ میں نے ان کے جنیوا میں شاپنگ کے خواب کو پورا نہیں ہونے دیا۔

مجھے یاد ہے کہ رخصت سے پہلے میرے دوست ارشد سمیع نے (جواب مرحوم ہو گئے ہیں) مجھ سے الجیرز ایئرپورٹ پر کہا کہ وزیراعظم تو دورہ کے انتظامات سے بہت مطمئن ہیں اور بے نظیر نے خود

مجھے گرمجوشی سے دورہ کے بہترین انتظامات کرنے پر دادِ تحسین سے نوازا تھا لیکن ان کے ساتھ آنے والے وزراء ناراض تھے جس کے جواب میں میں نے ارشد سمیع سے کہا تھا کہ میں وہاں پاکستان کے لیے خیر سگالی کو فروغ دینے کا ذمہ دار ہوں۔ وزراء کی خوشنودی حاصل کرنا میرے مشن میں شامل نہیں ہے اور اگر وہ مجھ سے اس وجہ سے برہم ہیں کہ میں نے ان کی خودغرضی کو پاکستان کی عزت اور وقار پر ترجیح نہیں دی تو یہ ان کا مسئلہ ہے میرا نہیں اور نہ ہی میری سفارت کا ہے۔

لیکن میری سفارت اور پاکستان کی نیک نامی دونوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ اس وقت پیدا ہو گیا جب وزیراعظم کے شوہر نامدار نے اس خصوصی ضیافت میں اپنی نصف بہتر کے ساتھ شرکت سے انکار کر دیا جو صدر شاذلی بن جدید نے اپنی نجی رہائش گاہ پر اپنے مہمان جوڑے کے لیے رکھی تھی۔

شاذلی بن جدید ہمارے چودھریوں، وڈیروں اور جاگیرداروں جیسے سیاسی رہنما نہیں تھے جن کے ہاں اندر کچھ نہیں ہوتا لیکن اوپری ٹیپ ٹاپ اور اکڑفوں بہت ہوتی ہے۔ وہ جہاں ایک سوشلسٹ حکومت کے سربراہ مملکت تھے تو ان کے نجی عملی اور منصبی کردار میں بھی سوشلزم نظر آتا تھا۔ اکثر صبح کو یہ ہوتا تھا کہ میں اپنی سرکاری گاڑی میں جسے میرا شوفر چلا رہا ہوتا تھا، اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے یہ دیکھتا تھا کہ صدر شاذلی اپنی گاڑی جس پر نہ الجزائر کا پرچم لہرا رہا ہوتا تھا نہ صدر کا، خود چلاتے ہوئے اپنے دفتر کی سمت جا رہے ہوتے تھے۔ ان کا ڈرائیور پیچھے کی نشست پر ہوتا تھا اور گاڑی کے آگے صرف ایک موٹر سائیکل سوار ہوتا تھا، غیر مسلح۔ برائے نام ان کے لیے راہ ہموار کرنے کے لیے لیکن یہ عام بات تھی کہ کسی ایک ٹریفک سگنل پر بتی سرخ ملتی تھی اور ان کی گاڑی بھی عام گاڑیوں کی طرح رک جاتی تھی اور میری بھی اور اکثر حسن اتفاق سے دونوں گاڑیاں ایک دوسرے کے برابر ہی رکتی تھیں۔ میری گاڑی پر لہراتے ہوئے سبز ہلالی پرچم کو دیکھ کر وہ سمجھ جاتے تھے کہ سفیرِ پاکستان بیٹھا ہے اور ہاتھ ہلا کر سلام کرنے میں کبھی وہ پہل کرتے تھے اور کبھی میں......اور میں بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ نام کی اسلامی جمہوریہ ہم ہیں لیکن ایک اسلامی مملکت کی روح سوشلسٹ الجزائر میں زیادہ سچائی کے ساتھ کارفرما دکھائی دیتی ہے۔

صدر شاذلی بن جدید نے اس قصرِ صدارت میں کبھی قیام نہیں کیا جو میرے دفتر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے بجائے وہ شہر سے باہر اپنے ذاتی مکان میں ہی رہا کرتے تھے جس میں زیادہ ٹیپ ٹاپ اور تام جھام نہیں تھا۔ یہی سادگی اور درویشی میں نے ترکی کے وزیراعظم بلند ایجوت میں دیکھی۔ وہ تو بہت ہی زیادہ فقیر منش تھے۔ وزیراعظم کے شاندار سرکاری مکان میں ایک دن نہیں رہے بلکہ اپنے تین کمروں کے فلیٹ میں رہا کرتے تھے اور سرکاری مصروفیات کے علاوہ جب کبھی باہر نکلتے تھے تو اپنی وہی پندرہ برس

پرانی Fiat گاڑی خود چلایا کرتے تھے جسے ہمارے ہاں اکڑی گردن والے نودولتیے ''کھٹارا'' کا نام دے دیتے ہیں اور ترکی کو ہمارے ہاں کے مذہبی جنونی کبھی اچھے لفظوں میں یاد یوں نہیں کرتے کیونکہ بقول ان کے ترکی میں کمال اتاترک کے زمانے سے مذہب کو ریاست سے بے دخل کر دیا گیا ہے جو صحیح بھی ہے اور غلط بھی...... غلط ان کی دانست میں یوں کہ ترکی میں ریاست نے مُلاؤں اور دو دو رکعت کے اماموں کو مذہب کی الٹی سیدھی تاویلیں کرنے کے لیے کھلی چھٹی نہیں دی ہے۔ وہاں ایک بہت بڑی وزارتِ اوقاف ہے جس کے پاس وسائل بھی ہیں اور اختیارات بھی اور یہ دونوں چیزیں سرکار کے تحت بننے والی مسجدوں کو...... وہاں مسجدوں کی انفرادی ملکیت کا تصور نہیں ہے، آباد بھی رکھتی ہیں اور مولوی کو بے لگام بھی نہیں ہونے دیتیں۔

پاکستان کی بازنطینی (Byzantine) سیاست کے یہ ناخوشگوار گوشے ایسے ہیں جو سنجیدہ دماغوں کو ایک عرصہ سے مبتلائے فکر رکھے ہوئے ہیں اور ابھی نہ جانے اور کتنے عشروں تک ہم ان بھول بھلیوں جیسی پیچیدگیوں سے نبرد آزما رہیں گے لیکن الجزائر کی اس شام جب جھٹ پٹے میں چند ساعتیں ہی باقی تھیں اور صدر شاذلی کی جانب سے ہماری وزیراعظم کے اعزاز میں خصوصی عشائیہ کی گھڑی دور نہیں تھی، میرے لیے لمحۂ فکریہ یہ تھا کہ وزیراعظم کے شوہرِ نامدار کی اس تقریب میں شرکت کو کیسے یقینی بنایا جائے۔

زرداری صاحب وزیراعظم کے ہمرکاب تھے اور نہیں بھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی شریک حیات کے ساتھ بادل ناخواستہ وہاں آئے تھے۔ اس لیے کہ پہلی شب میزبان وزیراعظم کے عشائیہ کے بعد سے وہ کسی بھی تقریب میں نظر نہیں آئے تھے۔ ان کا انداز ایسے تھا جیسے انہیں زبردستی وزیراعظم کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔ سرکاری مہمان خانے میں وہ اپنے کمرہ میں یوں بند ہو گئے تھے جیسے اعتکاف میں بیٹھ گئے ہوں۔ ان کا ناشتہ اور کھانا بھی کمرہ میں جاتا تھا بلکہ کھانے کے ضمن میں تو ان کی فرمائش یہ تھی کہ میرے گھر کے باورچی خانے سے ان کے لیے کھانا آئے اور اس فرمائش کو میری بیگم نے بخوشی قبول کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ زرداری صاحب کی خواہش یہ بھی تھی کہ انہیں ہندوستانی فلموں کے ویڈیو بھی فراہم کیے جائیں اور اس خواہش کی تکمیل میری بیٹی اور بیٹوں کے تعاون سے ہو رہی تھی کہ ان کے پاس تو ایسے ویڈیوز کی ایک پوری لائبریری تھی۔

زرداری صاحب کی یہ طرفہ خانقاہی اپنی جگہ لیکن پروٹوکول کے تقاضوں سے ان کی یہ کمال بے اعتنائی میرے لیے نمونۂ عبرت بھی تھی اور وجہ تشویش بھی۔ ان کی نظر میں شاید صدر شاذلی کے خصوصی دعوت نامے کی کوئی اہمیت یا وقعت نہ رہی ہو لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی عدم شرکت ہمارے لیے کیسی ندامت کا سبب بن سکتی تھی۔

لہٰذا ایک بار پھر میں نے صاحبزادہ یعقوب علی خاں سے مدد چاہی اور انہوں نے بھی مشکل کشائی میں دیر نہیں لگائی۔ انہوں نے وزیر اعظم کو معاملہ کی نزاکت کا احساس دلایا اور وزیر اعظم نے بظاہر اپنے شوہرِ نامدار کو عاقبت سجھائی اور وہ اس خصوصی عشائیہ میں شرکت پر آمادہ ہو گئے اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اگلی صبح ایئر پورٹ کی الوداعی تقریب میں بے نظیر بہت خوش نظر آ رہی تھیں جس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گزشتہ رات کا خصوصی عشائیہ کامیاب رہا تھا۔ ان کی روانگی سے پہلے صحافیوں کے ساتھ کانفرنس میں بھی بے نظیر نے تمام سوالات کے جواب بہت اعتماد کے ساتھ دیئے جس سے پاکستان کے معاملات، خصوصاً خارجہ تعلقات پر ان کی گرفت اور دسترس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا تھا۔

لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے ہمسفر وزیروں اور مشیروں کے منہ لٹکے ہوئے تھے بلکہ پھولے ہوئے تھے۔ بقول ارشد سمیع کے وہ سب مجھ سے اس بات پر ناراض اور کبیدہ خاطر تھے کہ میں نے ان کے منہ سے جنیوا کی تفریح کا تر نوالہ چھین لیا تھا لیکن میرے لیے ان کی ناراضگی کوٹ کے کالر پر جمنے والی گرد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی بلکہ میرے لیے تو اہمیت ان الوداعی کلمات کی تھی جو بے نظیر نے جہاز کی سیڑھی کے قریب مجھ سے مخاطب ہوتے وقت ادا کیے۔ میرے سلیقے اور تنظیم کی داد دی کہ میں نے وسائل کی کمیابی کے باوجود ان کے دورے کا انتظام و انصرام بہت تسلی بخش طور پر کیا۔ انہوں نے مجھے شاباشی دی اور توقع ظاہر کی کہ دوسرے سفراء بھی اس حسنِ انتظام کے ساتھ ان کے دوروں کو کامیاب بناتے رہیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اور جو ایک انوکھی بات ہوئی وہ یہ تھی کہ بے نظیر نے ارشد سمیع کی وساطت سے میری شریکِ حیات عابدہ کو اپنی طرف سے سونے کا ایک خوبصورت سیٹ ہدیہ کیا۔ بقول ارشد سمیع ان کے تجربے میں وزیر اعظم بے نظیر نے اس سے پہلے کتنے ہی ملکوں کے دورے کیے تھے لیکن پہلی بار یہ ہوا تھا کہ انہوں نے کسی سفیر کی بیگم کو اس طرح تحفے سے نوازا ہو۔ یہی نہیں بلکہ روانگی سے پہلے انہوں نے عابدہ سے اصرار کیا کہ ان کی نیک خواہشات ہمارے چھوٹے بیٹے اسد کو خاص طور سے پہنچائی جائیں۔ ان کے شکریئے کے ساتھ کہ اسد بیٹے نے بڑی محنت اور لگن سے یہ جاننے کے بعد کہ بے نظیر کو ڈاک کے نایاب ٹکٹ جمع کرنے کا بہت شوق ہے، ایک خوبصورت البم ترتیب دے کر انہیں گیسٹ ہاؤس میں روانگی سے پہلے پیش کیا تھا۔

بے نظیر کا دورہ کے ضمن میں اطمینان اپنی جگہ درست سہی لیکن مجھے یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ وزیروں اور مشیروں کے انتخاب میں ان کی قوتِ فیصلہ اور اصابتِ رائے نے ان کا ساتھ اس طرح نہیں دیا تھا جیسے توقع کی جا سکتی تھی۔

وہ لوگ جو بے نظیر کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے، گِدھ تھے۔ جو ہر اس جگہ پر جھپٹ پڑتے ہیں جہاں سے انہیں شکم خوری کی توقع ہو۔ ان میں سے زیادہ تر مجھے غرض اور ہوس کے غلام لگے۔ ان ہوس کے ماروں کو نہ پیپلز پارٹی سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ ہی بے نظیر سے بلکہ وہ تو صرف اپنا الّو سیدھا کرنے اور بہتی گنگا میں اشنان کرنے کے لیے حاکمِ وقت کے گرد ان کے بہی خواہوں کا روپ دھارے کھڑے تھے۔ مکھیوں کی طرح بے نظیر کے اطراف بھنبھناتے پھر رہے تھے۔ صرف اس نیت سے کہ انہیں اقتدار کی میٹھی ہانڈی میں منہ مارنے کا موقع مل جائے۔

یہ احساس میرے لیے خاصا تکلیف دہ اور مایوس کن تھا کہ بے نظیر کو انسان کی پرکھ نہیں تھی۔ ہوتی تو وہ ایسے غرض کے بندوں کو جیسے سرجن نصیر شیخ تھے، اپنے منہ نہ لگاتیں۔ میرا احساسِ مایوسی یوں اور تھا کہ بے نظیر سے قوم کو بہت زیادہ توقعات تھیں۔ وہ ملک کے سیاسی مطلع پر مارشل لا اور فوجی آمریت کے گیارہ طویل برسوں کی تاریکی کے بعد طلوع ہوئی تھیں، لہٰذا لوگ ان کی ذات سے ملک میں ایک نئی اور روشن صبحِ جمہوریت کی آس لگائے بیٹھے تھے لیکن وہ جو معروف کہاوت ہے کہ "ہر شخص اپنے احباب سے پہچانا جاتا ہے" وہ بے نظیر کے ضمن میں بھی اتنی ہی صائب اور مستند تھی جتنی کسی عام شخص کے باب میں۔

بلکہ ایک اعتبار سے بے نظیر کے سیاسی قد و قامت کے حوالے سے یہ سند زیادہ ہی معتبر ہو گئی تھی اس لیے کہ وہ ایک سیاستداں تھیں، ایک بہت بڑے سیاسی زعیم کی نہ صرف دختر تھیں بلکہ ان کے سیاسی ورثے کی مالک بھی تھیں، لہٰذا ان سے یہ توقع منسوب کرنا بالکل غلط نہیں تھا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کرتے ہوئے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ایسے وزیروں اور مشیروں کا انتخاب کریں گی جو سنجیدہ مزاج اور شعور مند ہوں گے نہ کہ ایسے Play boys جو راج سنگھاسن کا طواف محض اس لیے کر رہے تھے کہ انہیں تفریح اور عیش کے بہتر مواقع میسر ہوں اور وہ بھی سرکاری خزانے کی فیاضی سے!

بے نظیر بھٹو میں جاگیرداری کا خمیر ان کی اس کمزوری کا راز تھا کہ وہ اپنے گرد منڈلانے والے مطلبی جاہ پرستوں کو پرکھنے میں یا تو نادانستہ طور پر ناکام تھیں یا شاید جاگیرداری کلچر کے تقاضے اسی طرح پورے ہو سکتے تھے کہ وہ ان مکھیوں کو اپنے ارد گرد بھنبھناتے دیکھتی رہیں اور اسے اپنی مقبولیت سے تعبیر کریں۔

جاگیرداری کا یہی خمیر البتہ ان کے شوہر نامدار میں ان کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی قوی تھا۔ اگرچہ وہ اپنے خاندان کی بنیاد پر بے نظیر کے مقابلے میں بہت ہی معمولی قسم کے چھوٹے موٹے جاگیردار تھے لیکن وہ جو خالی برتن کے زیادہ زور سے بجنے کی کہاوت ہے وہ زرداری صاحب پر زیادہ صادق آتی تھی اور مجھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب کراچی سے پی آئی اے کے دو باورچی بطور خاص الجزائر بھجوائے گئے تا کہ وی وی آئی پی فلائٹ کے معزز مسافروں کے لیے کھانا تیار کر سکیں۔

ان باورچیوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ انہیں بھنڈی فراہم کی جائے کیونکہ بھنڈی زرداری صاحب کو بہت زیادہ مرغوب تھی اوراس کے بغیران کے لیے مینومکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے معلوم کروایا تو بھنڈی شہر میں تو کیا ملک بھر میں دستیاب نہیں تھی۔ الجزائر کٹر قسم کا سوشلسٹ نظریات کا ملک تھا جس میں موسم کے پھل اور ترکاریاں ہی ملتی تھیں اور بھنڈی کا موسم نہیں تھا، لہٰذا اس کی فراہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے اور میرے عملے نے جب باورچیوں کی فرمائش پوری کرنے سے معذوری ظاہر کی تو کھلبلی مچ گئی۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ زرداری صاحب کی فرمائش، جوان کے خدام کی نظر میں پاکستان کے بے تاج بادشاہ تھے، پوری نہ ہو، لہٰذا پیرس میں پی آئی اے کے منیجر کو فون کیا گیا اور وہاں سے اگلی فلائٹ سے دوکلو بھنڈیاں ڈپلومیٹک کارگو کے عنوان سے الجزائر میں وارد ہوئیں۔ اگلی صبح وی وی آئی پی فلائٹ کے مینو میں بھنڈیاں نمایاں تھیں اور الجزائری حکومت کا پروٹوکول کا محکمہ اور اس کے کارکنان انگشت بدنداں تھے کہ ان کے ہاں ایسی ناز برداریوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ بے نظیر الجزائر سے پورے تزک واحتشام کے ساتھ عراق سے ہوتی ہوئی وطن واپس گئیں۔ اس کے ہفتے بھر بعد صدام حسین نے کویت پر لشکر کشی کی اور ہفتے بھر کے اندر بے نظیر کی حکومت پاکستان میں ختم کر دی گئی۔ حالات کی اس اچانک کروٹ پر الجزائری حکومت کے اراکین حیرت زدہ رہ گئے۔ کئی وزیروں اور اعلیٰ حکام نے مجھ سے استفسار کیا کہ بے نظیر کے زوال میں ان کے دورۂ الجزائر کا تو کوئی کردار نہیں تھا؟ میں نے انہیں تسلی دلاسہ دیا کہ نہیں، نہ ان کا کوئی قصور تھا نہ بے نظیر کے ان کے ہاں مہمان ہونے نے اس میں کوئی کردار ادا کیا تھا بلکہ یہ پاکستان کی بازنطینی سیاست کے نشیب وفراز تھے۔ ہمارے سیاسی کلچر میں محلاتی سازشوں نے بے نظیر بھٹو کی منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور پاکستان کی نوزائیدہ جمہوریت کو اِک بار پھر ہوش سنبھالنے یا جوان ہونے سے پہلے ہی اس طرح گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا تھا جیسے ایام جاہلیت کے عرب معاشرہ میں نوزائیدہ بچیوں کو زندہ دفنا دیا جاتا تھا۔ پاکستانی بساطِ سیاست پر کھیلنے والے شاطر ایک مرتبہ پھر جمہوریت کو مات دینے میں کامیاب رہے تھے۔

بے نظیر کے ساتھ میرا اگلا آمنا سامنا کوئی چار برس بعد اگست ۱۹۹۴ء میں دوحہ، قطر میں ہوا۔ وہ اس وقت اپنی وزارت عظمیٰ کی دوسری اننگز کھیل رہی تھیں اور قطر میں اپنے سرکاری دورہ کے ساتھ ساتھ ایک پنتھ دوکاج کرنے کی نیت سے انہوں نے وہاں خلیج کے ممالک میں مقیم اپنے سفراء کو کانفرنس کے لیے طلب کر لیا تھا۔ ان کے دورۂ قطر کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ان کے شوہر نامدار آصف علی زرداری ان کے ساتھ نہیں تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ ان کے دورہ کا ماحول انتہائی خوشگوار تھا۔

لیکن اس سے زیادہ خوشگوار بات میرے اور میرے کئی اور ساتھیوں کے لیے یہ تھی کہ وزیراعظم

سفراء کی کانفرنس کے تمام اجلاسوں میں پورے وقت بہ نفسِ نفیس موجود رہیں اور صرف موجود ہی نہیں رہیں بلکہ پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سفراء کی تقاریر بھی سنتی رہیں اور ان سے متعلقہ سوالات بھی گاہے بگاہے کرتی رہیں۔

مجھے ان کی اس تبدیلی سے نہ صرف ذاتی طور پر مسرت ہوئی بلکہ یہ احساس بھی ہوا کہ انہوں نے اپنی پہلی وزارتِ عظمیٰ کی خامیوں اور کوتاہیوں سے سبق لیا تھا ورنہ مجھے یاد تھا کہ وزیراعظم بننے کے بعد انہوں نے اپنے سفراء کی پہلی کانفرنس جو اسلام آباد میں بلوائی گئی تھی، وہ جنوری ۱۹۹۰ء میں ہوئی تھی۔ جب انہیں وزیراعظم بنے ہوئے تقریباً سوا سال گزر چکا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اپنے سفراء کی بات سننے اور ان کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے سے انہیں کتنی وابستگی یا دلچسپی تھی۔

اس پوری کانفرنس میں، جو تین دن جاری رہی تھی، وہ افتتاحی اجلاس تک میں شرکت کے لیے تشریف نہیں لائی تھیں۔ اگرچہ پروٹوکول کے اعتبار سے افتتاح ان کی تقریر سے ہونا چاہیے تھا۔ ضیاء الحق سفراء کی ہر کانفرنس سے نہ صرف سب سے پہلے خطاب کرتے تھے بلکہ ہر اجلاس میں بہ نفسِ نفیس موجود بھی رہتے تھے اور بہت انہماک کے ساتھ کارروائی میں شرکت بھی کیا کرتے تھے لیکن بے نظیر نے کانفرنس کے کسی اجلاس کو رونق نہیں بخشی تھی۔ ہاں اتنا کرم انہوں نے ضرور کیا تھا کہ اختتامی اجلاس سے خطاب کرنے کے لیے بالکل آخری وقت میں بڑے شاہی جاہ و جلال اور تمکنت کے ساتھ تشریف لے آئی تھیں اور خطاب پڑھ کر (خطاب دفترِ خارجہ میں تحریر کیا گیا تھا) کسی سفیر سے گفتگو یا مزاج پرسی کیے بغیر اسی شان سے واپس روانہ ہوگئی تھیں۔ گویا رسمِ دنیا نبھانے کے لیے آئی تھیں۔ بقول شخصے محض دھیّا چھونے کے لیے ورنہ وہ اگر بالکل ہی شکل نہ دکھاتیں تو بھی ہم میں سے کون تھا جو ان کا کچھ بگاڑ سکتا!

لہٰذا قطر کی کانفرنس میں ان کی باضابطہ شرکت اور دلچسپی ہم سب سفراء کے لیے جہاں باعثِ حیرت تھی وہیں باعثِ طمانیت بھی تھی۔ بے نظیر کی لسانِ بدنی (Body Language) واضح اعلان اور انکشاف کرتی دکھائی دے رہی تھی کہ پہلی وزارتِ عظمیٰ کے قبل از وقت اختتام کے بعد انہوں نے حزبِ اختلاف کے خارِ مغیلاں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ سبق لیا تھا جو انہیں فروتنی اور خوش خلقی کے گلشن پر بہار سے قریب تر لے آیا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ آسمان سے زمین پر اتر آئی تھیں۔

قطر کانفرنس کے لیے وزیراعظم کے ہمراہ اسلام آباد سے جو اعلیٰ افسران آئے تھے۔ ان میں میرے عزیز دوست اور فارن سروس کے رفیق ظفر علی ہلالی بھی تھے۔ ظفر ان دنوں دفترِ خارجہ کی طرف سے وزیراعظم کے سیکریٹیریٹ میں ایڈیشنل سیکریٹری کے طور پر تعینات تھے۔ دورانِ قیام ظفر نے مجھے بتایا کہ ان کے دفتر میں ایک سمری (Summary) تیار ہو رہی تھی جس میں ان سینئر افسروں کے نام تھے

جنہیں قومی اسمبلی کے تحت قائم اعلیٰ اختیاراتی کشمیر کمیٹی کی معاونت کے لیے تجویز کیا جاسکتا تھا۔ضرورت صرف ایک اعلیٰ افسر کی تھی جو کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کمیٹی کے سربراہ (چیئرمین) نوابزادہ نصراللہ کی مدد کرسکے اور ظفر کے کہنے کے مطابق جو نام سرفہرست تھا وہ اس خاکسار کا تھا۔

میرے لیے یہ اطلاع دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ تشویش کا باعث بھی تھی اور اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ اس وقت میرا منجھلا بیٹا انگلستان میں یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔کویت میں سفیر ہونے کے ناطے میرے خارجہ الاؤنس مجھے اتنی مالی گنجائش دے رہے تھے کہ میں اس کو وہاں بہ سہولت پڑھا سکوں۔چھوٹا بیٹا بھی ہائی اسکول کے آخری مراحل میں تھا اور انگلستان جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ظاہر ہے کہ اسلام آباد واپسی کی صورت میں میرے لیے ان کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنا ناممکن ہو جاتا۔

لیکن دوسری وجہ زیادہ وزنی تھی اور وہ یہ کہ نوابزادہ نصراللہ کی شہرت ان کے سیاسی حلقوں اور مداحوں میں چاہے جو بھی رہی ہو سرکاری حلقوں میں وہ بہت بدنام تھے۔غصہ ان کی ناک کی پھلنگ پر دھرا رہتا تھا۔شاید اس کی وجہ ان کی سیاسی زندگی بھر کی یاسیت رہی ہو کہ بیچارے ہمیشہ حزبِ اختلاف میں رہے تھے اور اقتدار کا ساغرِ مینا ان کے سامنے تو ہمیشہ رقص میں رہا تھا لیکن ان کی دسترس سے دور تھا اور اپنی اس یاسیت یا فرسٹریشن کو وہ جا بے جا افسران پر نکالتے رہتے تھے۔سو میرے لیے ان جیسے ہزیمت خوردہ اور بگڑے ہوئے نوابزادہ کے ساتھ کام کرنے میں دلکشی کی کوئی رمق نہیں تھی، لہٰذا میں نے اپنے دوست ظفر سے درخواست کی کہ وہ کوشش کرے کہ میرا نام اس فہرست سے خارج ہو جائے۔ظفر نے مدد کا وعدہ کیا اور اسلام آباد واپسی کے ہفتے بھر بعد ہی فون کرکے مجھے مژدہ سنایا کہ مجھے اس عذاب سے بچانے کی کوشش بار آور رہی تھی۔

اس وقت تک میں نے نوابزادہ نصراللہ کو نہ کبھی قریب سے دیکھا تھا اور نہ ہی ان کے حسنِ سلوک کا مجھے کوئی ذاتی تجربہ تھا لیکن اس کے چند ماہ بعد ہی جب وہ صدر فاروق لغاری کے ہمرکاب کویت تشریف لائے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے ساتھ کام نہ کرنے کا فیصلہ کرکے میں نے کتنی بڑی عقلمندی کی تھی۔

نوابزادہ صاحب تو خیر صدر فاروق لغاری کے شریک وفد کے ایک مقتدر ہمراہی تھے لیکن وفد میں ایک بے نشان اور غیر معروف ہستی اس جوان کی تھی جو ان کے ہمراہ ہمہ وقت سائے کی طرح رہتا تھا تاکہ انہیں اٹھا بٹھا سکے۔اس لیے کہ نوبزادہ صاحب بیچارے جسمانی صحت کے اعتبار سے خود سے اٹھنے بیٹھنے کے لائق بھی نہیں تھے لیکن میرے لیے اس سے زیادہ تشویشناک ان کی ذہنی کیفیت تھی۔

کویت میں پاکستان کا سفیر ہونے کے ناطے ظاہر ہے کہ صدر فاروق لغاری اور ان کے ہمراہ آنے والی پوری برات کی نگہداشت اور دیکھ بھال کی ذمہ داری میری تھی لیکن یہ میری ذمہ داری نہیں تھی

کہ میزبان کویتی حکومت کے ارباب پروٹوکول صدر کے ہمراہیوں میں سے کس کو کہاں ٹھہراتے ہیں۔ وہ سب لوگ اپنے کام میں منجھے ہوئے تھے۔ عراقی قبضے کے بعد جب سے کویت دوبارہ آزاد ہوا تھا، وہاں غیر ملکی وفود اور سربراہانِ مملکت یا حکومت کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا اور کویتی پروٹوکول میں تعینات ذمہ دار افسران جن میں سے کئی ایک میرے عزیز دوست تھے، اپنے کام میں طاق ہو چکے تھے اور ان کی مشاقی اور مہارت پر کویت میں تعینات کسی غیر ملکی سفیر کو کوئی شائبہ نہیں تھا۔

لیکن نوابزادہ نصراللہ نے سرکاری مہمان خانے ''قصرِ بیان'' پہنچنے کے دس منٹ کے اندر اندر مجھے، میرے افسروں اور کچھ اور لوگوں کی موجودگی میں اس بات پر سرزنش کی کہ میں نے اس انتہائی اعلیٰ درجے کے پرتکلف قصر میں ان کی رہائش اور قیام پر مناسب توجہ نہیں دی تھی۔ میرے لیے ان کی شکایت بے جا اور ناقابل فہم تھی اس لیے کہ بے چارے کویتیوں نے تو پروٹوکول کے قواعد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نوابزادہ صاحب کو کابینہ کے وزراء کے مساوی درجہ دیا تھا اور ان کے لیے وزیر کے شایانِ شان ویسا ہی کمروں کا سویٹ مختص کیا تھا جیسا کہ صدر کے ہمراہ آنے والے وزراء کو دیا تھا جبکہ نوابزادہ صاحب کا رتبہ وزیر اعظم کے مشیر کے مساوی تھا۔ کویتیوں میں بزرگی کا خیال اور لحاظ بالعموم بہت رکھا جاتا ہے اس لیے انہوں نے نوابزادہ صاحب کی پیرانہ سالی کا احترام کیا تھا۔

لیکن نوابزادہ صاحب اس سے قطعاً مطمئن نہیں تھے۔ انہیں شکایت یہ تھی کہ صدر لغاری چونکہ انہیں اپنے کنبے کا ایک فرد شمار کرتے تھے، لہٰذا ان کی رہائش قصرِ مہمانداری کے اسی فلور پر ہونی چاہیے تھی جہاں صدر اور ان کے اہل خانہ کو ٹھہرایا گیا تھا۔ میں نے ان کے گلے کے جواب میں بڑے تحمل سے کہا کہ مجھے قطعاً اس کی سن گن نہیں تھی کہ وہ لغاری صاحب کے اہلبیت میں سے تھے لیکن ان کے شکوے شکایت پر مجھے معاً سرجن نصیر شیخ یاد آ گئے جنہیں الجزائر میں مجھ سے اسی طرح کا گلہ ہوا تھا۔

میں نے نوابزادہ صاحب کے حضور وضاحت کی کہ مجھے اس پر قطعاً کوئی تعرض نہیں تھا کہ وہ لغاری صاحب کے اہلبیت میں سے تھے لیکن ساتھ ہی یہ عرض بھی کی کہ دفتر خارجہ سے میرے لیے دورہ کے آغاز سے قبل جو بریف آیا تھا اس میں اس قسم کا کوئی اشارہ یا عندیہ نہیں تھا کہ نوابزادہ صاحب کو لغاری کے اہل خانہ میں شمار کیا جائے۔

نوابزادہ نصراللہ کے متعلق میں نے اس سے پہلے بہت کچھ سنا تھا لیکن مجھے اس کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی پست سوچ کے حامل تھے۔ ویسے ان کے جاگیردارانہ پس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی اتنی تعجب کی بات نہیں تھی۔ جاگیرداری کی نفسیات میں یہ عنصر بہت غالب رہتا ہے کہ بڑے کے آگے بھیگی بلی بن جاؤ اور چھوٹے کو غرّا کے آنکھیں دکھاؤ۔ اس صفت کو عام زبان میں Bully کرنا کہا جاتا ہے

اور میں نے نوابزادہ صاحب کے قیام کویت میں اس کے اور بھی کئی مظاہر دیکھے۔ فاروق لغاری صاحب سے بات کرتے ہوئے ان کے لب ولہجہ میں حلاوت ہوتی تھی لیکن مجھ سے یا میرے افسروں میں سے کسی سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے تکلّم میں وہ مخصوص رعونت عود کر آتی تھی جو جاگیردارانہ کلام کا خاصا ہے۔ ان فراعین کے نزدیک جو جاگیردار نہیں ہے وہ رعیّت ہے اور اس اعتبار سے کسی عزت واحترام کا سزاوار نہیں ہے۔

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں ان کی کشمیر کمیٹی کے تارِ عنکبوت میں الجھنے سے بچ گیا ورنہ میرا کیا حشر ہوتا اس کا اندازہ مجھے ان دو تین دنوں میں بخوبی ہو گیا تھا جو نوابزادہ جیسے انا پرست اور خود پسندی کے جنون میں مبتلا شخص کے ساتھ اس عالم میں گزرے کہ میں بہر حال سفیرِ پاکستان تھا اور نوابزادہ صاحب کی گرفت سے آزاد تھا۔

رہائش کے معاملہ میں اہلبیت کے مرتبے پر فائز نہ ہونے کے بعد نوابزادہ صاحب کسی کھسیانی بلّی کی طرح کھمبا تو نوچ نہیں سکتے تھے لیکن سفارتخانے کے عملے کے ساتھ انہوں نے زبانی نوچ کھسوٹ شروع کر دی۔ ان کا اصل معرکہ اس خاکسار سے ہوا اور وہ بھی کویت میں مقیم پاکستانیوں کی تعداد اور گنتی کے موضوع پر جس پر ہمارا خیال تھا کہ ہمیں کامل دسترس حاصل تھی لیکن نوابزادہ صاحب آمادۂ پیکار تھے کہ جو وہ جانتے تھے وہ ہماری پہنچ سے بہت دور کی بات تھی اور جن حقائق کے وہ دانا بلکہ دانائے راز تھے اس کا علم ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں تھا۔

مجھ سے انہوں نے یہ شکایت کی کہ عراقی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد کویت لوٹ کر واپس آنے والے پاکستانیوں کی تعداد ان کی دانست میں کم تھی۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ ان کی معلومات کے مطابق اس وقت کویت میں پاکستانیوں کی تعداد کیا تھی؟

انہوں نے جواب دیا کہ چالیس پچاس ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے عرض کی کہ کویتی حکومت کے اپنے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت کویت میں آباد پاکستانیوں کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی جبکہ ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراقی قبضے کے وقت پاکستانیوں کی کل تعداد ستّر ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس عاجز نے دن رات محنت اور بھاگ دوڑ کر کے اپنے ہم وطنوں کو تیل کی دولت سے مالا مال اس ریاست میں زیادہ سے زیادہ روزگار فراہم کرنے اور آباد کرنے کا کام کیا تھا اور یہی وہ ذمہ داری تھی جو سابق وزیراعظم نواز شریف نے مجھے کویت میں تعینات کرتے ہوئے سونپی تھی۔ میں تو ذاتی طور پر دوبارہ کویت آنے کے حق میں نہیں تھا لیکن میاں صاحب کا اصرار تھا کہ کوئی ایسا سفیر مقرر کیا جائے جو کویت میں پہلے بھی رہ چکا ہو۔ وہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہو اور اپنے پرانے تعلقات کی بنیاد پر

پاکستانیوں کی وہاں دوبارہ آبادکاری اور بحالی کے لیے راہ ہموار کر سکے۔

لیکن نوابزادہ صاحب پر میرے دلائل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مسلسل یہی رٹ لگاتے رہے کہ میرے اعداد و شمار درست نہیں ہیں۔ میں نے زچ ہو کر سوال کیا کہ ان کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟ جواب میں انہوں نے شانِ بے نیازی سے کہا کہ ان کے کچھ سیاسی مریدوں نے انہیں حقائق اور اعداد و شمار بتائے ہیں۔

نوابزادہ صاحب کی خود پسندی کی اس سے بھی بدتر شہادت مجھے اس واقعہ کے چند ماہ بعد جدہ میں حج کے موقع پر ملی۔ یہ ۱۹۹۵ء کے اوائل گرما کی بات ہے جب میں اپنی شریک حیات اور دو بہنوں کے ہمراہ کویت سے حج کرنے کے لیے جدّہ پہنچا تھا اور میری تیسری بہن جو جدّہ میں رہتی تھیں، ہمارے ساتھ شامل ہو گئی تھیں۔ ہم سب لوگ اس قافلے میں شریک تھے جو جدّہ کے پاکستانی قونصلیٹ کے زیرِ اہتمام و انصرام مناسکِ حج کے لیے منیٰ کا رخ کرنے والا تھا لیکن اس سال ایامِ حج سے دو دن پہلے منیٰ میں حجاج کے خیموں میں آگ لگ گئی جس سے بہت سے خیمے جل گئے۔ اب یہ شاید ہمارا امتحان تھا کہ آگ اس حصے میں لگی تھی جس میں پاکستانی قونصلیٹ کے عازمین حج کو قیام کرنا تھا۔ اس آفت نے قونصلیٹ کے افسران اور دوسرے عملے کے افراد کے لیے ایک بڑا انتظامی مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ مسئلہ درپیش یہ تھا کہ خیموں کی تعداد کم پڑ گئی تھی۔ اس لیے کہ بہت سے جل گئے تھے اور اس قلیل جگہ میں اتنے بہت سے عازمین حج کے لیے رہائش کی سہولت فراہم کرنا ایک امتحان سے کم نہیں تھا۔

منیٰ کے لیے قافلے کی روانگی سے ایک شام قبل میں اپنے پرانے شریکِ کار عارف کمال کے گھر پر بیٹھا ان کے ساتھ اس غیر متوقع پیش رفت پر ہی بات کر رہا تھا۔ عارف میرے چھوٹے بھائی کی طرح تھے۔ انہوں نے میرے ماتحت کویت اور ٹوکیو دو سفارتخانوں میں کام کیا تھا اور ان دنوں جدّہ میں قونصل جنرل کی حیثیت سے تعینات تھے۔ ہم دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ اس افتاد سے کیسے نبرد آزما ہوں کہ عارف کے پاس نوابزادہ نصر اللہ کا فون آیا۔ نوابزادہ صاحب پاکستان سے آنے والے سرکاری حج وفد کے رکن تھے۔ وفد کے تمام اراکین کے لیے احرام بھی حکومت کے صرفے سے فراہم کیے گئے تھے۔

نوابزادہ صاحب فون یوں کر رہے تھے کہ خیموں میں آتشزدگی کی خبر ان تک بھی پہنچ گئی تھی لیکن ان کی فون کال اس لیے نہیں تھی کہ وہ قونصل جنرل سے اس کی نئی اور گراں بار ذمہ داری پر اظہارِ ہمدردی کر رہے تھے یا کرنا چاہتے تھے بلکہ اس لیے تھی کہ ان کے لیے ہر حال میں ایسے خیمے کا بندوبست کیا جائے جس میں ایئر کنڈیشنر ہوتا کہ انہیں گرمی نہ لگے۔

بیچارہ عارف کمال حیران و پریشان میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں سر پیٹ رہا تھا، اپنے سیاسی

زعماء کے اخلاقی زوال اور پستی پر۔ نوابزادہ نصر اللہ کا شمار تو ان زعماء میں ہوتا تھا جو جغادری سمجھے جاتے تھے اور جن کے متعلق شہرت یہ پھیلائی جاتی تھی کہ ان کے دل تو عوام کی محبت سے سرشار ہیں اور عوامی خدمت کا جذبہ ہی ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ بے نظیر نے نوابزادہ نصر اللہ کی قماش کے آثارِ کہنہ کیوں اپنے گرد جمع کر رکھے تھے؟ آخر کیا مجبوری تھی، کونسی مصلحت تھی جس نے بے نظیر کے دامن کو ایسے کاٹھ کباڑ سے بھر دیا تھا؟ ایسے دقیانوسی خیالات کے حامل، غرض کے بندوں کو ساتھ لے کر چلتے ہوئے کیسے ممکن تھا کہ بے نظیر بھٹو اپنے دعوؤں کے مطابق پاکستان کو ایک روشن خیال، ترقی پذیر اور متمدن ریاست میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

نوابزادہ نصر اللہ جیسے بیکارِ محض قسم کی ایک اور ذاتِ شریف مولانا فضل الرحمان کی تھی جنہیں بے نظیر نے سنیٹ کی خارجہ امور کمیٹی کا چیئرمین نامزد کیا تھا۔ کیا کیا گنجہائے گرانمایہ بے نظیر نے اپنی کچن کیبنٹ میں بھر لیے تھے!

مولانا فضل الرحمٰن کا تجربہ مجھے نوابزادہ صاحب کے چونکا دینے اور آنکھیں کھول دینے والے حادثے سے چند ماہ بعد اس وقت ہوا جب وہ اپنی اس بلند بانگ حیثیت میں کویت کے سرکاری دورہ پر تشریف لائے۔ ان کی آمد سے چند دن پہلے میرے نام وزیراعظم بے نظیر کا ایک خصوصی خفیہ تار موصول ہوا جس میں وزیراعظم نے میری توجہ خاص طور پر مولانا کے منصبِ عالیہ کی طرف مبذول کرواتے ہوئے مجھے حکم دیا اور سخت تاکید کی کہ مولانا ایک اہم مشن پر کویت بھیجے جا رہے ہیں تاکہ وہ کویتی پارلیمان کے کلیدی اراکین کو مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے موقف سے آگاہ کر سکیں اور اس کے لیے کویتی حکومت اور دیگر خلیجی ممالک کی ہمدردی اور حمایت حاصل کریں۔ ظاہر ہے کہ وزیراعظم کے اس فرمان کے بعد میں مولانا کی کویت آمد کو پوری سنجیدگی سے نہ لینے کی جسارت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ میرے لیے یہ ایک لمحہ کو تعجب کا سامان ضرور تھا کہ کشمیر کمیٹی کے چیئرمین تو نوابزادہ صاحب تھے لیکن مہم سر کرنے کے لیے مولانا کے نام قرعہ نکلا تھا۔ آخر اس کا سبب کیا تھا؟

میری سمجھ میں تو اس کی صرف ایک ہی وجہ آتی تھی اور وہ یہ کہ نوابزادہ نصر اللہ جیسے گرگِ باراں دیدہ کو اپنے ساتھ لے کر چلنا بے نظیر کی مجبوری تھی۔ سیاست میں ایسے بے ڈول بندھن اکثر و بیشتر بندھتے رہتے ہیں اور اس اعتبار سے بے نظیر، نوابزادہ اتحاد کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن بے نظیر کو یہ ادراک بھی تھا کہ پاکستان کی بیرونی دنیا میں نمائندگی نوابزادہ جیسے پیرتسمہ پا کو نہیں سونپی جا سکتی تھی جس شخص کو اٹھانے بٹھانے کے لیے بھی ایک ہمراہی کی ضرورت ہو۔ اس کی ذہنی توانائی بھی معرضِ خطر تھی اور کشمیر جیسے

حساس مسئلے کی ترجمانی کوئی گڑیا کا کھیل تو تھی نہیں جو ہر کس و ناکس کے ہاتھوں میں دے دی جاتی۔
لیکن مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ ان کی آمد کے بعد ٹھیک آدھ گھنٹہ گزارنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کام کے لیے ان کا انتخاب بھی کوئی دانائی نہیں تھی۔
ہوا یوں کہ مولانا کے دورہ کی پہلی صبح میں انہیں کویتی پارلیمان کی خارجہ امور کمیٹی سے ملاقات کے لیے لے گیا۔ کویت کی پارلیمان خلیجی ممالک میں اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے۔ ایک تو یوں کہ خلیج کے کسی اور ملک میں اس نوع کی آزاد اور کھلے بندوں منتخب ہونے والی پارلیمان کا وجود نہیں ہے۔ اگرچہ حق رائے دہی صرف ان کویتیوں کو حاصل ہے جو خود یا ان کے اجداد بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں کویت کی ریاست قائم ہونے کے وقت ریاست کے اصل شہری تھے۔ یہی لوگ کویتی اصطلاح میں اول درجے کے شہری ہیں اور انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ سیاست میں پوری طرح حصہ لے سکیں اور پچاس رکنی پارلیمان کے اراکین کو منتخب بھی کر سکیں۔ بیسویں صدی ختم ہونے تک ان درجۂ اوّل کے کویتیوں میں بھی حق رائے دہی صرف مردوں کو حاصل تھا لیکن اکیسویں صدی کے اجراء نے اب کویت کی خواتین کو بھی یہ حق تفویض کر دیا ہے۔
میرے دورِ سفارت میں جب مولانا فضل الرحمٰن بحیثیت چیئرمین خارجہ امور کمیٹی (پاکستان کی قومی اسمبلی میں) کویت کے مہمان بن کر آئے تو کویتی پارلیمان کی خارجہ امور کی کمیٹی کے چیئرمین ہی ان کے ہم منصب اور ہم رتبہ تھے۔ ڈاکٹر جاسم الصقر ان کا نام نامی تھا۔ ستر پچھتر کے پیٹے میں تھے لیکن انتہائی مستعد اور چاق و چوبند۔ نوجوانی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس گئے تھے اور وہیں سے قانون اور معاشیات میں ڈاکٹریٹ کی سند لی تھی۔ ان کے برادرِ بزرگ عبدالعزیز الصقر کویتی چیمبر آف کامرس کے صدر تھے اور اس عہدہ پر اس دن سے مسلسل کام کرتے آ رہے تھے جس دن سے چیمبر نے کام کا آغاز کیا تھا۔ اس اعتبار سے انہیں اس منصب پر فائز ہوئے تیس برس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ الصقر خاندان کویت کے ممتاز ترین اور امیر ترین خاندانوں میں شمار ہوتا تھا اور پورے کویت میں اس خاندان کے افراد اہم ترین مناصب پر فائز تھے۔ عبدالعزیز صقر اس وقت اسّی پچاسی برس کے تھے لیکن اپنے چھوٹے بھائی کی طرح وہ بھی انتہائی چاق و چوبند تھے۔ اپنی جوانی کے ایام میں وہ برسوں کراچی میں رہے تھے، لہٰذا اردو بڑی روانی سے بولتے تھے۔ میرے ساتھ ان کا سلوک اوّل دن سے ایک مہربان اور شفیق بزرگ کا سا تھا۔ میں جب چاہتا تھا ان سے ملاقات کے لیے چلا جاتا تھا اور وہ پھر مجھے گھنٹے دو گھنٹے سے پہلے اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ مزے لے لے کر مجھے اپنی نوجوانی کے وہ قصے سنایا کرتے تھے جو کراچی سے وابستہ تھے۔
کویتی پارلیمان کی خارجہ امور کمیٹی کے پانچ چھ دیگر اراکین بھی تھے جو سب کے سب اعلیٰ تعلیم

یافتہ تھے۔سب کے پاس امریکہ یا برطانیہ سے یونیورسٹی کی اسناد تھیں اور وہ سب ہی بین الاقوامی امور سے خود کو کما حقہ واقف رکھتے تھے۔میری ان میں سے زیادہ اصحاب کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔کویتی پارلیمان میں بھی اور ان کے دیوانیوں میں بھی جہاں ہر کسی کو رسائی حاصل تھی۔

مولانا فضل الرحمٰن کا سب نے ہی بہت تپاک سے استقبال کیا اور پھر ہم سب اس کانفرنس روم میں جا کر بیٹھ گئے جو اس قسم کی ملاقاتوں کے لیے مخصوص تھا۔جاسم الصقر صاحب نے مولانا کو باضابطہ اور خوشگوار الفاظ میں خوش آمدید کہنے کے بعد ان سے درخواست کی کہ وہ جس مقصد کے لیے وارد ہوئے ہیں۔ وہ بیان کریں لیکن مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ کشمیر پر پاکستانی موقف سے میں حاضرین کو آگاہ کروں۔

مجھے حیرت ہوئی کہ مولانا خود اس فریضے کی ادائیگی سے کیوں جان چھڑانا چاہ رہے ہیں، لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ مولانا کو یاد دلاؤں کہ وہ پاکستان کے خصوصی ایلچی بن کر وارد ہوئے ہیں اور وزیراعظم بے نظیر کی خصوصی ہدایات کے بموجب میں انہیں اس ملاقات کے لیے لے کر گیا تھا۔

مولانا کچھ قائل ہوئے کچھ نہیں ہوئے لیکن خاموشی جب بوجھل ہونے لگی تو انہوں نے رک رک کر اردو زبان میں پانچ سات منٹ تک کلمات ادا کیے جن کا میں انگریزی میں ترجمہ کرتا رہا لیکن پھر جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ مولانا نفسِ مضمون کی طرف نہیں آ رہے ہیں اور معزز سامعین بھی ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ رہے ہیں، لہٰذا حالات کو مزید بگڑنے دینے سے بچانے کی نیت سے میں نے لقمہ دیا کہ مولانا اگر پسند فرمائیں تو گفتگو کو میں آگے بڑھاؤں اور یوں لگا جیسے مولانا اسی لمحے کے منتظر تھے۔انہوں نے فوراً حامی بھر لی اور سامنے میز پر رکھے ہوئے کیک پیسٹری کی طرف رجوع ہو گئے اور پھر ایک گھنٹے تک ان کی طرف سے میں ہی بولتا رہا اور وہ اپنے پیٹ کی میزبانی کرتے رہے۔

اس ذمہ داری سے فارغ ہو کر ہم باہر نکلے تو میرا گمان یہ تھا کہ مولانا میرا شکریہ ادا کریں گے کہ میں ایک مشکل وقت میں ان کے کام آیا تھا لیکن مولانا نے تو گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھتے ہی مجھ سے ایک نئی فرمائش کر دی اور فرمائش یہ تھی کہ ان کی ملاقات کویت کی بین الاقوامی شہرت کی حامل فلاحی تنظیم بیت الزکوٰۃ کے صدر اور روحِ رواں جاسم الجی صاحب سے کروا دی جائے۔

کویت کی یہ فلاحی تنظیم دنیا بھر کے مسلم ممالک میں مدرسوں، ہسپتالوں، یتیم خانوں اور اس قسم کے دوسرے فلاح و بہبود کے اداروں کو مالی وسائل فراہم کرتی ہے۔کویتی دنیا میں اپنی فضول خرچیوں اور عیاشیوں کے لیے بدنام ہیں لیکن زکوٰۃ ادا کرنے کے معاملہ میں اسلامی احکامات کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور اپنی زکوٰۃ کا بڑا حصہ بیت الزکاۃ کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے دنیا کے نادار مسلمانوں تک ان کی زکات پہنچ سکے۔

مولانا کو کسی طرح سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جاسم الجی صاحب سے میرے بہت اچھے مراسم ہیں۔ میں ان کو کویت میں اپنے پہلے دورِ تقرری سے جانتا تھا۔ جب وہ حکومت میں وزیرِ مذہبی اموراوراوقاف تھے۔ وہ اس مرتبہ پر ایک طویل مدت تک فائز رہے۔ مجھ پر وہ اس دور میں بھی مہربان تھے جب میں سفیر نہیں تھا اور میں سفیر کی حیثیت میں دوبارہ تعینات ہو کر کویت لوٹا تو وہ وزارت سے فارغ ہونے کے بعد بیت الزکاۃ کے سربراہ بن چکے تھے۔ انہیں یہ ذمہ داری ان کی ساکھ اور اسلامی ممالک میں شہرت کے سبب دی گئی تھی۔ بیت الزکاۃ کے پاس کروڑوں ڈالر کا سرمایہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس کو ایمانداری کے ساتھ دنیا کے غریب مسلمانوں کے فیض کے لیے استعمال کرنے کے لیے ان کے جیسے بے داغ کردار کے مالک کا سربراہ ہونا ایک نعمت سے کم نہیں تھا لیکن بیت الزکاۃ اپنے وسائل کو جی صاحب کی سربراہی میں اندھا دھند نہیں لٹاتا تھا۔ انہوں نے وسائل کے بہترین استعمال کے لیے ایک طریقۂ کار وضع کیا تھا جس میں سائل کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ جب امداد مانگنے کے لیے آئے تو اس کے پاس کسی منصوبے کی تمام تفصیلات ہوں اور اگر منصوبہ کسی نئے ادارہ کے قیام یا موجودہ ادارہ کی توسیع سے متعلق ہو تو اس کی Feasibility Study کے ساتھ ساتھ تعمیراتی کام کی متعلقہ ڈرائنگ بھی ہمراہ ہوں۔

مولانا میرے معزز مہمان تھے۔ وزیرِ اعظم بے نظیر کے خصوصی ایلچی بن کر تشریف لائے تھے، لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں انہیں جی صاحب کے پاس لے جانے سے انکار کر دیتا لیکن میں نے مولانا کو پوری وضاحت سے بیت الزکاۃ کے طریقہ کار کے متعلق بریفنگ دی اور سوال کیا کہ آیا وہ اپنے ہمراہ متعلقہ منصوبے کی تفصیلات لے کر آئے ہیں اور مولانا نے مجھے اطمینان دلایا کہ ان کے پاس سب کچھ تھا اور وہ پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئے تھے۔

لیکن دوسری صبح ملاقات کے دوران جب جی صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ وہ اپنے مدرسے کی جس توسیع کی بات کر رہے ہیں اور جس کے لیے انہیں بیت الزکاۃ سے امداد کی ضرورت ہے اس کے لیے ضروری دستاویزی کارروائی انہوں نے کر لی ہے اور ان کے پاس ضروری کاغذات ہیں یا نہیں، تو مولانا نے اعتراف کیا کہ ان کے پاس سوائے اعداد و شمار کے جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے کاغذ پر قلمبند کیے ہوئے تھے۔ اور کوئی تفصیل نہیں تھی۔

مولانا کا یہ اعتراف اور ان کا یوں خالی ہاتھ اس میٹنگ کے لیے پایا جانا ظاہر ہے کہ میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ جی صاحب نے ان کا بہت تپاک سے خیر مقدم کیا تھا لیکن مولانا نے اپنے رویّہ سے ان کے لیے بھی شرمندگی کا سامان کیا تھا۔ انہوں نے معذرت کی کہ ضروری دستاویزی کارروائی کی عدم موجودگی میں وہ مولانا کے لیے کچھ کرنے سے قاصر ہیں لیکن مولانا کی طرف سے میرے لیے اس سے

بڑی شرمندگی کا سامان تو اسی روز شام کو فراہم ہوا!

ہوا یوں کہ مولانا کے اعزاز میں اس شام کویت کے ایک اور معروف ادارہ Kuwait Propagation Society نے ایک تقریب کا انعقاد کیا تھا۔ یہ انجمن جسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی، کویت میں مقیم ہزارہا غیر مسلموں میں تبلیغ کے فرائض سرانجام دیتی تھی لیکن بہت سلیقے سے۔ اس کے مرکزی دفتر میں ایک بڑی لائبریری تھی جس میں بے شمار زبانوں میں اسلام کے بنیادی عقائد کے متعلق لٹریچر فراہم رہتا تھا۔ یہ سب کام خوش اسلوبی سے ہوتا تھا اور اس میں کسی جبر کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ادارہ کے کرتا دھرتا سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب تھے جن میں سے زیادہ تر مغربی ممالک کی جامعات سے فارغ التحصیل تھے۔

مولانا کی ایک تو سرکاری حیثیت تھی لیکن اس سے بڑھ کر کویت میں ان کی شہرت ایک اور حوالے سے تھی اور وہ حوالہ تھا ان کے والد مرحوم مفتی محمود کا، جن کا نام کویتی حلقوں میں بڑے احترام سے لیا جاتا تھا، ایک عالم دین ہونے کے ناطے۔ میں خود اس کا گواہ تھا۔ اس لیے کہ میرے پہلے دورِ سفارت میں ایک مرتبہ مفتی محمود وہاں تشریف لائے تھے اور جس تپاک سے کویت کے معززین نے انہیں اپنا مہمان بنایا تھا اس نے میرے ذہن پر بہت خوشگوار اثرات چھوڑے تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن کو کویت کی اس تبلیغی تنظیم نے ان کی سرکاری حیثیت سے ماوراء ان کی دینی شہرت اور مرتبے کی بنیاد پر مدعو کیا تھا اور منتظمین کی یہ خواہش تھی کہ مولانا شام کو ان کے ساتھ کچھ وقت گزاریں اور خاص طور پر ان نومسلموں کو اپنے تبحرِ دینی سے مالا مال کریں جو اس ادارہ کی تبلیغی مساعی کے نتیجے میں مسلمان ہوئے تھے۔

تقریب کے لیے جو وقت مولانا کو دیا گیا تھا، اس وقت تک وہاں سوڈیڑھ سو لوگ جمع تھے۔ میری مصروفیت کہیں اور تھی اور اس وجہ سے میں نے منتظمین سے معذرت کرلی تھی لیکن وقتِ مقررہ سے ایک گھنٹے بعد میں جس تقریب میں مدعو تھا وہاں میرے لیے مولانا کے میزبانوں کا بہت پریشانی کا فون آیا کہ وہ سب ان کا انتظار کر رہے ہیں لیکن مولانا کا کوئی پتہ نشان نہیں ہے اور وہ تقریب کے لیے ایک گھنٹہ گزرنے کے باوجود نہیں پہنچے ہیں۔ یہ اطلاع میرے لیے دوہری پریشانی کا سبب تھی۔

پہلی پریشانی تو اس شرمندگی سے عبارت تھی جو مجھے مولانا کے میزبانوں سے ہوئی۔ وہ بیچارے خلوص کے مارے مولانا کو عزت اور مرتبہ دینے کے لیے ہمہ تن حاضر تھے لیکن مولانا غائب تھے، لاپتہ تھے اور ڈیڑھ سو لوگوں کو اپنے انتظار میں مبتلا رکھے ہوئے تھے۔

لیکن مولانا تھے کہاں؟ یہ دوسری پریشانی کی بات تھی۔ مجھے یہ تو اطمینان تھا کہ کویت جیسی محفوظ جگہ میں ان کے اغوا کے امکانات تو نہ ہونے کے برابر تھے لیکن سوال یہ تھا کہ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے

جہاں ان کی حفاظت کے لیے سکیورٹی کے افراد تعینات تھے، کیسے لاپتہ ہو سکتے تھے؟

مولانا کے ہراساں و پریشان میزبانوں سے فون پر جتنی معذرت میں کر سکتا تھا وہ میں نے کی اور انہیں اطمینان دلانے کے لیے یہ بھی کہا کہ میں جلد از جلد مولانا کو ڈھونڈ لانے کی کوشش کروں گا اوران کا جلسہ درہم برہم نہیں ہونے دوں گا۔ میں خود جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوا لیکن اس سے پہلے فون پر میں نے اپنے ایک افسر کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ مولانا کا سراغ لگائے اور کویتی پروٹوکول کو بھی خبر دی کہ مولانا لاپتہ ہو گئے ہیں اور درخواست کی کہ ان کا اتا پتہ معلوم کرے۔

آدھے گھنٹے کے بعد جب میں جلسہ گاہ پہنچ چکا تو کویتی پروٹوکول کے ایک ذمہ دار افسر نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ مولانا شہر سے باہر پٹھانوں کے ایک ڈیرے میں ضیافت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میرے اپنے ماتحت نے فون پر یہ خبر سنائی کہ مولانا ضیافت تو اڑا رہے تھے لیکن ساتھ میں اپنے مدرسوں کے لیے چندہ بھی جمع کر رہے تھے۔ مجھے بے ساختہ اکبرالہ آبادی کا یہ شعر یاد آ گیا کہ ؎

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

سو مولانا اپنے مداحوں سے ہر پہلو سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے کی تاخیر سے جب مولانا وہاں جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو میزبان تو بیچارے کچھ نہ کہہ سکے لیکن میں نے مولانا سے صاف الفاظ میں شکوہ کیا کہ انہوں نے اس مصروفیت پر اپنی ذاتی مصروفیت کو جس کا نہ مجھے پہلے سے علم تھا اور نہ ہی کویتی میزبانوں کو، ترجیح دے کر نہ صرف اپنے آپ کو شرمندہ کیا تھا بلکہ میرے ساتھ ساتھ ملک وقوم کو بھی اور اپنی اس حرکت سے انہوں نے ملک کے وقار کو دھچکا پہنچایا تھا۔

مولانا وہاں تو سب کے سامنے کچھ نہ کہہ سکے لیکن پاکستان واپس پہنچنے کے بعد انہوں نے بے نظیر سے شکایت کی کہ سفیر نے ان کے احترام میں کسر چھوڑی تھی لیکن ان کو یہ علم نہیں تھا کہ ان کے وار کرنے سے پہلے میں اپنی حفاظت کا بندوبست کر چکا تھا اور ان کی شکایت سے پہلے میری تحریری شکایت جس میں میں نے پورے واقعے کا تفصیل سے ذکر کیا تھا، وزیر اعظم تک پہنچ چکی تھی۔ میری پیش بندی میرے کام آ گئی۔ اس لیے کہ وزیر اعظم نے مولانا کی شکایت کے ضمن میں مجھ سے نہ کوئی سوال کیا نہ کوئی وضاحت طلب کی۔

البتہ مولانا کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے تھا جو وہ نہیں ہوئے کہ میں نے وزیر اعظم کو اس معاملہ کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی جو بیت الزکاۃ میں مولانا کی کاسہ لیسی کے حوالے سے ہوا تھا اور جس میں مجھے ایک بہت پرانے اور مشفق کویتی بزرگ کے سامنے شرمسار ہونا پڑا تھا۔ نہ ہی میں نے مولانا کی اپنے اصل مشن میں اس پھسڈی کارگزاری کا زیادہ تذکرہ کیا تھا جس کے لیے انہیں کویت خاص طور پر بھجوایا گیا

تھا بلکہ صرف یہ تحریر کرنے پر ہی اکتفا کی تھی کہ مولانا اپنے مشن کی خاطر خواہ ادائیگی کے لیے غالباً اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے بھرپور تیاری نہیں کر سکے تھے۔اس سے زیادہ پردہ میں مولانا کی صریح ناکامی پر اور کیا ڈال سکتا تھا۔

لیکن پھر میں نے سوچا کہ میں اگر مولانا کے ضمن میں اپنے تلخ تجربے کی پوری روداد بھی وزیر اعظم کو بلاکم وکاست تحریر کردیتا تو اس سے کیا فرق پڑتا؟

مولانا اور نوابزادہ جیسے پیرانِ تسمہ پا کو اپنی ٹیم میں ان کی تمام تر کوتاہیوں کے باوصف شامل کرنا اور شامل رکھنا بے نظیر بھٹو کی مجبوری تھی۔ ہماری محلاتی اور بازنطینی سیاست میں عروج تو زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کو نصیب ہوا ہے جو خواجہ سراؤں کے زمرے میں آتے ہیں۔ جوہر اور استعداد، لیاقت و قابلیت جیسے اوصاف کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ ہر وزیر اعظم یا صدر جو بھی سریر آرائے سلطنت ہو، صرف اور صرف ایک مصلحت کو مدّنظر رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اس کا اقتدار مضبوط رہے اور اس کو دوام حاصل ہو۔اس مصلحت کے پیش نظر سیاسی حلیف چنے جاتے ہیں اور انہیں ان کے تمام ترعیوب اور خامیوں کے باوجود مناصب اعلیٰ سے نوازا جاتا ہے۔اس بحث میں کون سر کھپاتا ہے، سوائے چند ہمارے جیسے منچلوں کے کہ اکثر خواجہ سرا باہر کی دنیا میں ملک اور قوم کی جگ ہنسائی کا باعث بن جاتے ہیں۔

بے نظیر کو تو ویسے بھی آدمیوں کی پرکھ نہیں تھی اور ان کی شخصیت کا یہی جھول بالآخر ان کے زوال اور ہر اعتبار سے ناگہانی موت کا سبب بنا جو بلاشبہ ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

لیکن میں نے یہ دیکھا کہ بے نظیر کے برعکس فاروق لغاری میں آدمی کی پرکھ کا ملکہ تھا اور اس کا اندازہ مجھے ان کے دورۂ کویت کے دوران ہوا جس میں ایک واقعہ نے خاص طور پر ان کی فردشناسی کا رنگ مجھ پر کھولا۔

ہوا یوں کہ کویت میں صدر لغاری کے دورہ کی چند ہفتے قبل سن گن پا کر وہاں پر قائم پیپلز پارٹی کے سیل متوقع طور پر حرکت میں آ گئے تھے۔میں نے سیل میں جمع کا صیغہ سہواً نہیں استعمال کیا ہے بلکہ حقیقتاً وہاں اس عوامی جماعت کی سربراہی کے کم از کم دو بڑے جغادری قسم کے دعویدار تھے۔ان میں سے ایک جو اپنے آپ کو نہ صرف کویت بلکہ پورے خلیج کے ممالک کے لیے پیپلز پارٹی کے چیئرمین ہونے کے بھاری بھرکم منصب سے بزعمِ خود نوازتے تھے، کویت میں ایک عدد چینی ریستوران کے مالک تھے جس میں سرمایہ کاری کویت کے ایک بہت بڑے شخص کی تھی جس کے رتبے کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ وہ ایسے چھٹ بھیّے پر اعتماد کرتا ہوگا۔شبہ یوں اور بھی بڑھتا تھا کہ یہ حضرت داغدار ماضی رکھتے تھے اور ویسے بھی کویت میں اپنی اوچھی حرکات کے لیے بہت بدنام تھے۔اس پر طرّہ یہ کہ کسی طرح انہوں نے

کینیڈا میں دو چار برس گزار کر وہاں کی شہریت بھی حاصل کر لی تھی اور اپنے کینیڈین پاسپورٹ کو وہ امتیازی سند کے طور پر عامۃ الناس میں اپنا قد بلند کرنے کے لیے جابجا استعمال کرنے میں کبھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

دوسرے صاحب نسبتاً زیادہ متین اور بردبار تھے۔ سندھ کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور کویت کی پورٹس اتھارٹی میں ایک اچھے خاصے عہدہ پر فائز تھے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کا اصرار یہ تھا کہ وہ اور صرف وہی کویت میں پیپلز پارٹی کا جائز نمائندہ اور قیادت کا حقدار تھا اور دوسرا شخص جعلی اور ڈھونگیا تھا۔

جتنا جتنا صدر لغاری کے دورہ کا وقت قریب آتا گیا اتنا اتنا ان دونوں حضرات کی طرف سے مجھے اس استدلال پر قائل کرنے کے لیے مختلف ذرائع سے اثر و رسوخ کا استعمال بڑھتا گیا کہ صرف جناب الف یا جناب ب ہی اس کے حقدار ہیں کہ انہیں جنابِ صدر سے ملاقات کا موقع فراہم کیا جائے تاکہ وہ ان سے پارٹی کے امور کی بابت بات کر سکیں اور عوام الناس کی نظروں میں اس حوالے سے سرخرو ہو سکیں کہ انہیں پارٹی کا جائز اور واحد صدر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

میں نے ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی نہ کوئی وعدہ کیا تھا اور نہ ہی انہیں یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ میں انہیں صدر لغاری تک رسائی بہم پہنچاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کویتی میزبانوں سے ان میں سے کسی کے لئے بھی ''قصر بیان'' تک رسائی کی سفارش نہیں کی تھی۔ ''قصر بیان'' امیر کویت کا جدید ترین محل تھا جس کی تعمیر کویت پر عراقی حملے اور قبضے سے کچھ مہینے پہلے ہی مکمل ہوئی تھی اور قبضے کے دوران عراقیوں نے اس میں توڑ پھوڑ بھی کی تھی لیکن اسے سرعت کے ساتھ مرمت کرنے کے بعد امیر نے فیصلہ کیا تھا کہ قصر بیان ان کے مہمان سربراہان حکومت یا مملکت کے قیام کے لیے مخصوص ہوگا۔ امیرِ کویت بذاتِ خود پرانے قصرِ امیری میں ہی قیام پذیر تھے لیکن دونوں حضرات دنیادار تھے اور جوڑ توڑ کے ماہر، لہٰذا وہ میری معاونت کے بغیر بھی قصرِ بیان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

میرے لیے یہ بڑے مخمصے کی بات تھی کہ میں دونوں میں سے کس کو ترجیح دوں اور کس کو نہیں، لہٰذا میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ معاملہ فاروق لغاری صاحب کے گوش گزار کر دیا اور فیصلہ ان پر چھوڑ دیا کہ وہ کس سے ملاقات کرنا پسند کریں گے؟

لغاری صاحب کی دوررسی اور معاملہ فہمی کا میں اس وقت قائل ہو گیا جب انہوں نے جواب میں ایک لحہ تامل کیے بغیر مجھ سے کہا کہ میں دونوں موذیوں کو بیک وقت جنابِ صدر کی خدمت میں پیش کر دوں اور میں نے دیکھا کہ میری مشکل آسان کرتے وقت ان کے چہرے پر بڑی کھلی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

فاروق لغاری نے دونوں کی بات بڑے تحمل سے سنی اور اپنے اس تاسف کا بھی اظہار کیا کہ کویت میں پارٹی کی قیادت بٹی ہوئی اور منتشر ہے۔ انہوں نے قیادت کے دونوں دعویداروں کو یہ کہہ کر شرم دلانے کی کوشش بھی کی کہ جب وہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پارٹی کے ایک عام رکن یا کارکن کے لیے وہ کیسے کوئی اچھی مثال قائم کر سکتے ہیں۔

لیکن دونوں جغادری بڑی چکنی مٹی کے بنے تھے۔ لغاری صاحب کی فہمائش یا نصیحت کا ان پر ذرّہ برابر بھی اثر نہیں ہوا اور ہر ایک اصرار کرتا رہا کہ صرف اور صرف وہی کویت میں چیئرمین ہونے کا حقدار ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

ان کا اصرار لغاری صاحب کے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا، لہٰذا انہوں نے دونوں کی بات رد کرتے ہوئے اور یہ کہہ کر ملاقات ختم کر دی کہ وہ بے نظیر کو اس مسئلہ سے آگاہ کر دیں گے اور قیادت کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیں گے۔ اس لیے کہ پارٹی کی چیئرپرسن تو بہر حال وہ ہی تھیں۔

دونوں موذیوں کے جانے کے بعد لغاری صاحب نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے سوال کیا کہ میں ایسے لوگوں کے ساتھ کس طرح گزارا کرتا ہوں؟

اور جواب میں میں نے یہ کہتے ہوئے بحث تمام کر دی کہ ایسے موذیوں کے ساتھ گزارا کر کے میں انعام کا حقدار ہو گیا ہوں۔ لغاری صاحب نے میری اس رائے سے اتفاق کیا کہ کویت جیسی جگہ میں، جہاں پاکستانیوں کی اتنی بڑی نفری پائی جاتی ہے، سفارت کانٹوں کا بستر ہے۔ چیونٹیوں بھرا کباب۔

دورۂ کویت میں لغاری صاحب کے ہمراہ ان کی بیگم اور دو بیٹیاں بھی تھیں اور بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ خواتین آئیں اور بغیر شاپنگ کیے چلی جائیں اور پھر فاروق لغاری تو ویسے بھی بڑے جاگیر دار تھے، لہٰذا وسائل کی کمیابی کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔

مجھ سے جب لغاری صاحب کے ملٹری سکریٹری نے یہ فرمائش کی کہ بیگم صاحبہ اور بچیوں کے لیے شاپنگ کے انتظامات کروا دیے جائیں تو میں نے فی الفور کویتی پروٹوکول سے رابطہ کیا اور پروٹوکول نے شہر کے بہترین شاپنگ مال میں شاپنگ کے لیے سکیورٹی کے جملہ لوازمات مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ دو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انگریزی داں کویتی لڑکیوں کو جن کا تعلق پروٹوکول کے محکمہ سے تھا، یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ معزز خواتین کو ہمراہ لے کر شاپنگ مال جائیں۔

شاپنگ کے معاملات کا تجربہ ہمیں اپنے بیجنگ کے دورِ سفارت سے بطورِ خاص ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی مہینہ نہیں جاتا تھا جب پاکستانیوں کا ایک آدھ وفد نہ آتا ہو، چین سے تعلقات کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ اور یہ بھی کبھی نہیں ہوا کہ وفد کے معزز اراکین اور عمائدین بیجنگ سے بغیر شاپنگ کیے خالی ہاتھ

چلے گئے ہوں۔ اکثر تو یہ بھی ہوتا تھا کہ چینی میزبان چھٹی کے دن اپنے پاکستانی مہمانوں کے لیے خصوصی طور پر فرینڈ شپ اسٹور کھلوا دیا کرتے تھے۔ اس دور میں فرینڈ شپ اسٹور صرف غیر ملکیوں کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔ چینیوں کو وہاں خریداری کرنا تو درکنار داخلہ کی سہولت بھی نہیں تھی اور غیر ملکیوں میں سب سے بڑے خریدار ہمارے پاکستانی وفود ہوا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بیجنگ کے سفارتی حلقوں میں یہ لطیفہ زبان زدِ عام ہو گیا تھا کہ جب پاکستانی وفود فرینڈ شپ اسٹور میں خریداری کر کے جاتے ہیں تو پھر وہاں صرف فرینڈ شپ باقی بچتی ہے اسٹور تو سب پاکستانی خرید لے جاتے ہیں۔

کویت میں تو ظاہر ہے کہ دنیا کے کونے کونے سے ایک سے ایک عمدہ سامانِ تعیش آتا تھا۔ وہاں کے شاپنگ پلازہ یا مال دیکھ کر تو ہمارے لوگوں کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔

لغاری کنبے کی خریداری کے اگلے روز جب پورا قافلہ انہیں رخصت کرنے ہوائی اڈے جا رہا تھا تو میں نے ان لڑکیوں سے جو کنبے کے ہمراہ شاپنگ کرانے لے گئی تھیں، پوچھا کہ ان کا تجربہ کیسا رہا؟ اور جواب میں انہوں نے جو کہا وہ میرے لیے چونکا دینے والا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم کویتی عورتیں اپنی شاپنگ کے لیے بہت بدنام ہیں اور ہم پر الزام ہے کہ ہم خریداری پر روپیہ پانی کی طرح بہاتی ہیں لیکن کل آپ کے صدر کی بیگم اور بیٹیوں کی خریداری نے تو ہمیں بھی مات کر دیا۔ ہمیں تو حیرت یہ تھی کہ پاکستانیوں کو تو ہم لوگ بہت غریب سمجھتے ہیں لیکن کل بیگمات کی خریداری دیکھ کر تو ہمیں اپنے غریب ہونے کا احساس ہوا۔

اس وقت تو میں نے یہ گمان کیا تھا کہ وہ لڑکیاں شاید مبالغہ سے کام لے رہی ہیں اور زیبِ داستان کے لیے حاشیے لگا رہی ہیں لیکن ان کی بات کے سچ ہونے کا ثبوت مجھے اس وقت ملا جب لغاری صاحب کی وطن واپسی کے کوئی ہفتے بھر بعد ان کے ملٹری سکریٹری نے مجھے اسلام آباد سے فون کر کے یہ فرمائش کی کہ بیگم صاحب نے کویت کی فلاں فلاں دکان سے فلاں رنگ کا جو مخمل خریدا تھا، وہ کچھ کم پڑ گیا ہے آپ ایک میٹر اور بھجوا دیجیے۔ میں نے جب اس دکان سے پتہ کروایا کہ ایک میٹر مخمل کی قیمت کیا ہو گی تو معلوم ہوا کہ وہ کپڑا تو اسی دینار میٹر تھا یعنی کوئی ڈھائی تین سو ڈالر کا۔

میں نے بلا توقف ملٹری سکریٹری کو فون کیا اور کہا کہ اگر انہیں وہ کپڑا اور چاہیے تو اس کے پیسے بھجوانے کا بندوبست کریں۔ اس لیے کہ سرکاری حساب کتاب میں تو میرے پاس جنابِ صدر کے کنبے کے لیے کپڑے کی خریداری کی کوئی مد نہیں ہے۔

میرے کھرے ٹکا سے جواب نے غالباً ملٹری سکریٹری کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ شاید ان کے لیے یہ انوکھا تجربہ رہا ہو کہ کسی سفیر نے جنابِ صدر کو خوش کرنے کے لیے اپنی جیب ہلکی کرنے سے یوں صاف انکار کر دیا ہو۔

مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے میرا پیغام جنابِ صدر تک پہنچایا تھا کہ نہیں اور اگر پہنچایا تھا تو لغاری صاحب کا ردِعمل کیا تھا؟ لیکن اس کے بعد میرے پاس اس ضمن میں مزید کوئی فون نہیں آیا لیکن اس مہنگے بلکہ مہنگے ترین مخمل کی خریداری پر مجھے بیگم ضیاء الحق یاد آ گئیں کہ لغاری گھرانے کی خواتین کے برعکس ان میں کس درجہ سادگی بلکہ درویشی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں جب وہ اپنے شوہر صدر ضیاء الحق کے ساتھ بیجنگ تشریف لائی تھیں تو ایک سہ پہر میری بیوی کو ساتھ لے کر شاپنگ کرنے نکلی تھیں اور عابدہ جب صدر کی بیگم کو جو اس وقت پاکستان کی خاتون اول تھیں، شاپنگ کروانے کے بعد واپس آئیں تو ان کا پہلا جملہ یہ تھا کہ میں نے آج تک ایسی سادہ عورت نہیں دیکھی جو خاتونِ اول ہونے کے باوجود شاپنگ اس احتیاط سے کر رہی تھیں جیسے ان کے شوہر کی آمدنی انتہائی محدود ہو۔ بے چاری نے پوری شاپنگ پر سو ڈالر بھی خرچ نہیں کیے تھے جبکہ ہم نے تو اسی بیجنگ میں پاکستانی جرنیلوں اور ایئر مارشلوں کی بیگمات کو اس طرح شاپنگ کرتے دیکھا تھا کہ ان کے ہینڈ بیگ سو سو ڈالر کی گڈیوں سے بھرے ہوتے تھے اور فرینڈ شپ اسٹور کا بڑھیا سے بڑھیا سامان وہ قیمت پر نظر ڈالے بغیر خرید لیا کرتی تھیں۔ ایک ایئر مارشل کی بیگم نے تو اتنا سامان خریدا تھا کہ ہمارے ایئر اتاشی کو وہ سامان بیجنگ ایئر پورٹ تک، جہاں ایئر فورس کا ایک C-130 طیارہ اسی مقصد سے کھڑا ہوا تھا، لے جانے کے لیے ٹرک کا بندوبست کرنا پڑا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ لغاری صاحب نے بے نظیر کو اپنی پارٹی کی تنظیم یا بدنظمی کی کویت کی حد تک کیا رپورٹ پیش کی تھی اور انہیں اس عجیب و غریب تجربے سے آگاہ کیا تھا کہ نہیں جس سے وہ دوچار ہوئے تھے۔ لیکن بے نظیر کو میرے بارے میں رپورٹیں اپنے کویت کے پارٹی وفاداروں کی طرف سے متواتر مل رہی تھیں اور ان بے بنیاد اور بے ہودہ رپورٹوں کا نزلہ مجھ پر بہت جلد گرا بھی۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کویت میں یہ عوامی پارٹی ایک عرصہ دراز سے دو چودھریوں کی لیڈری کی ہوس کے ہاتھوں غریب کی جورو بنی ہوئی تھی جس پر ہر ایک بھابھی کہنے کا حق شدّ و مد کے ساتھ استعمال کر رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پارٹی کی مرکزی قیادت میں کسی کو ہوش نہیں تھا کہ ان دو مولویوں میں مرغی کیسے حرام ہو رہی تھی اور پارٹی کے نام پر تھو تھو ہو رہی تھی۔

پارٹی کا وہ دھڑا جس کی قیادت اور علمبرداری کا دعویٰ اس شخص کو تھا جو کویت میں ایک عدد چینی ریستوران چلا رہا تھا، اس میں زیادہ تر شورہ پشت قسم کے لوگ تھے۔ وہ جو کہاوت ہے کہ کند ہم جنس باہم پرواز تو جو کردار اس دھڑے کے خود ساختہ اور منہ بولے چیئرمین کا تھا، وہی اس کے حلقہ بگوشوں کا بھی تھا۔

یہ شخص داغدار ماضی رکھتا تھا۔ اس کا باپ پاکستان کے رسوائے زمانہ قاسم بھٹی گینگ کا سرکردہ رکن تھا لیکن ۱۹۶۰ء میں جب پاکستان میں کسی حد تک قانون کی حکمرانی تھی، ایوب خاں کے دور میں اس

اسمگلروں کے گینگ کا قلع قمع کر دیا گیا اور یہ ذاتِ شریف اور ان کے والدِ بزرگوار پاکستان سے سرپٹ بھاگے۔ یہ لوگ سونے کی اسمگلنگ کرتے تھے اور اس تجارت کا گہرا تعلق خلیجی ممالک سے تھا، لہٰذا یہ دونوں باپ بیٹے فرار ہو کر خلیج کی طرف بھاگے اور بیٹے نے کویت میں پناہ لی جہاں کے شیوخ تک اس کی رسائی تھی۔ انہوں نے اسے پناہ دے دی کہ اپنے خاص شوق پورے کرنے کے لیے شیوخ کو ایسے دلالوں کی ضرورت اکثر و بیشتر پڑتی رہتی ہے اور شیخوں نے ہی اسے ریستوران چلانے کے لیے وسائل بھی مہیا کر دیئے۔ ویسے بھی ریستوران کا کاروبار بہت سے دوسرے مشاغل پر پردہ ڈالنے کے لیے مناسب سمجھا جاتا ہے۔

اس بیہودہ اور بدزبان شخص کو اپنے ہر اس کارنامے پر فخر تھا جس کا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی شریکِ حیات ایک جرمن خاتون تھی جو اس سے پہلے کویت ایئرویز میں ایئر ہوسٹس ہوا کرتی تھی۔ پورا کنبہ اس بات پر فخر کرتا تھا کہ اس کے پاس کینیڈا کی شہریت اور پاسپورٹ تھا اور نور و روشنی سے قطعاً بیگانہ باپ اور صاحبزادے پارٹی کے وفاداروں کی موجودگی میں اپنے کینیڈین پاسپورٹ فخر سے لہرایا کرتے تھے۔ یہ جتانے کے لیے کہ وہ حکومتِ پاکستان سے خائف نہیں ہیں کیونکہ ان کے پاس ایک اور ٹھکانہ بھی ہے۔

یہ غیر ملکی پاسپورٹ لہرانے کی رسم ہمارے پاکستانی سیاستدانوں کو کچھ زیادہ ہی بھا گئی ہے۔ ایک حق پرست رہنما جو برسوں سے انگلستان میں پناہ لیے ہوئے ہیں، انہیں بھی جب برطانوی پاسپورٹ ملا تھا تو انہوں نے بھی انتہائی فخر و تمکنت کے ساتھ وہ پاسپورٹ اپنے سینے سے چپکا کر تصویریں بنوائی تھیں اور پھر یہ تصویریں پاکستان کے سیاسی اور سماجی حلقوں میں مہینوں طنز و مزاح کا سامان فراہم کرتی رہیں۔

پیپلز پارٹی کا یہ لیڈر ایک انتہائی لچر انسان تھا جس کی گفتگو اور نشست و برخاست میں سفلہ پن تھا۔ ظاہر ہے کہ شیوخ کی خدمت کرنے والے کا کردار اور کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے پہلے دورِ سفارت میں جب ہمارے نئے سفیر مہدی مسعود صاحب نے اپنے کاغذاتِ سفارت پیش کرنے کے بعد پاکستانیوں کے ایک بہت بڑے اجتماع سے کویت کے شیراتون ہوٹل میں خطاب کیا تو یہ شخص ان کی تقریر کے درمیان اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے سفیرِ محترم، حکومتِ پاکستان اور خصوصاً جنرل ضیاء الحق کے خلاف مغلّظات کی بارش شروع کر دی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی لیکن سزا پر اس وقت تک عمل نہیں ہوا تھا۔

میں جب سفیر بن کر کویت دوبارہ پہنچا تو اس شخص نے مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میں چونکہ اس کی رگ رگ سے واقف تھا، لہٰذا میں نے اسے منہ نہیں لگایا تھا۔ ویسے بھی وہ میاں نواز شریف کی وزارت کا زمانہ تھا جس میں پیپلز پارٹی والے کم از کم کویت میں خاصے لئے دیئے رہتے تھے۔

لیکن ۱۹۹۳ء میں جیسے ہی نواز شریف کی جگہ بے نظیر نے ایک بار پھر وزارتِ عظمیٰ کی باگ ڈور سنبھالی، ان کی پارٹی والے سانپ کی طرح کینچلی بدل کر ہر کس و ناکس پر رعب ڈالنے لگے۔ اتھلے، بے پیندے اور بے ضمیر لوگ ایسی ہی اوچھی حرکتیں کیا کرتے ہیں۔

ایک دن ذاتِ شریف اپنے دو تین موالیوں کے ساتھ سفارتخانے میں میرے سب سے جونیئر افسر سے ملاقات کے لیے بغیر کسی طے شدہ ملاقات کے وقت کے اس کے دفتر میں کرّ و فر کے ساتھ نازل ہوئے اور اس سے یہ مطالبہ کیا کہ کیونکہ اب اس کی پارٹی کی حکومت تھی، لہٰذا وہ سفارتخانے سے اسلام آباد میں کوئی بھی رپورٹ بھیجے تو اسے ضرور دکھایا جائے۔ اللہ اللہ! ''آ گئی خاک کے ذروں کو بھی پرواز ہے کیا!''

وہ غریب نوجوان تھرڈ سکریٹری جو اپنی سفارت کاری کا آغاز کر رہا تھا اس عجیب و غریب ''حکم'' پر حیران پریشان سیدھا میرے پاس آیا اور چیئرمین صاحب نے اپنے ساتھیوں سمیت راہِ فرار اختیار کی۔

تھرڈ سکریٹری ملک نے جب پوری روداد مجھے سنائی تو میں نے فوراً چپراسی کو دوڑایا کہ دیکھے اگر وہ کہیں نظر آ جائے تو اسے میرے دفتر تک لے کر آئے لیکن وہ سفارتخانے کی حدود سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ روانہ ہو چکا تھا۔

میں نے ملک کو تسلی دی کہ وہ اس قسم کی گیدڑ بھبکیوں سے پریشان نہ ہو۔ کیونکہ وہ سفلہ جاتے جاتے ملک کو دھمکی دے گیا تھا کہ اگر اس کی ہدایت پر عمل نہ ہوا تو وہ وزیرِ اعظم تک رپورٹ پہنچا دے گا۔

میں نے ملک سے یہ بھی کہا کہ وہ اس شخص تک یہ پیغام پہنچا دے کہ آئندہ اگر کبھی مجھے یہ اطلاع ملی کہ وہ سفارتخانے کی حدود میں داخل ہوا ہے تو میں ایک لمحہ کا توقف کیے بغیر پولیس کو کارروائی کے لیے طلب کر لوں گا۔

میری دھمکی اثر کر گئی۔ اس لیے کہ اس کے بعد حضرت نے کبھی کسی افسر پر رعب جمانے یا کوئی ناجائز مطالبہ کرنے کی جسارت نہیں کی تھی لیکن اس کے بعد سے اس نے اور اس کے شورہ پشت موالیوں نے میرے خلاف دشنام طرازی کی ڈاک بٹھا دی۔

میرے خلاف مہم میں سب سے اوچھا ہتھیار جو استعمال کیا گیا وہ یہ شرانگیز پروپیگنڈا تھا کہ میں ایم کیو ایم کا سفیر ہوں جبکہ مجھے اس پارٹی سے دور دور کا بھی علاقہ نہیں تھا لیکن صرف اس وجہ سے کہ میں اردو بولنے والا تھا یا بقول کسے تلیر تھا، لہٰذا یہ الزام مجھ پر لگا دینا بہت آسان تھا۔

میں یہ تو جانتا تھا کہ بے نظیر بھٹو کا تعلق جس طبقہ سے تھا...... وڈیروں، جاگیرداروں اور چودھریوں کا ثقافتی اور تمدنی جوہڑ جس میں کبھی کبھار ہی کوئی بے نظیر جیسا کنول کھل اٹھتا تھا، اس میں لوگ کانوں کے بہت کچے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جھوٹی تعریف سننے کے اتنے عادی ہو چکے ہوتے ہیں کہ

پھر تعریف کے سوا ہر بات ان کی تیوریوں پر بل ڈال دیتی ہے۔

مجھے آج تک اس کا قلق ہے کہ بے نظیر اپنی تمام تر مغربی تعلیم کے باوجود اپنے انحطاط پذیر سماجی پس منظر سے کبھی خود کو آزاد نہیں کرسکیں۔ دیکھا جائے تو یہ بہت بڑا سماجی اور تمدنی المیہ ہے جس کا زہر آج ہمیں اپنی سیاست کے رگ و پے میں موجزن دکھائی دیتا ہے۔ مغربی یونیورسٹیوں سے سند لے لینا کوئی کارنامہ نہیں ہے اور نہ ہی تعلیمی سند اس بات کی ضمانت فراہم کرتی ہے کہ چار پانچ برس مغرب کے ارتقائی اور روح پرور ماحول میں بسر کرنے کے بعد وڈیرہ شاہی کی صدیوں پرانی کالک بدن سے اتر جائے گی۔

آج تک ہمارے جاگیرداروں اور وڈیروں میں سے اگر ہزاروں نہیں تو سیکڑوں، افراد مغربی جامعات سے اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کر چکے ہیں۔ انگلستان کی قدیم روایتی جامعات جیسے آکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ میں تو روایات کا آج تک اتنا پاس اور لحاظ ہے کہ اگر ان کے قدیم طلباء جن کا تعلق ان کی دانست میں اشرافیہ یعنی Nobility سے رہا ہو، کی اولادیں جیسے کوئی پوتا، پوتی، نواسہ یا نواسی ان کے ہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ کی خواہش ظاہر کرے تو اسے مطلوبہ معیار پر پورا نہ اترنے کے باوجود صرف روایتی پاسداری اور شرما حضوری میں داخلہ دے دیا جاتا ہے۔

ہمارے طبقۂ امراء کے یہ سند یافتہ افراد ڈگریاں تو لے آتے ہیں لیکن مغربی معاشرہ کی کلید یعنی طبقاتی اونچ نیچ سے بالاتر سماجی مساوات اور انصاف پر مبنی معاشرہ کو وہیں سمندر پار چھوڑ آتے ہیں۔ ان کے اقوال میں تو ضرور اس کلیدی ضرورت کو وقتاً فوقتاً دہرایا جاتا ہے۔ خاص طور پر انتخابات کے موضوع پر جب عوام کو سبز باغ دکھا کر ووٹ لینا مقصود ہوتا ہے لیکن افعال اور کردار میں اس کی ذرا سی بھی جھلک نظر نہیں آتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے لارڈ میکالے جیسے سامراجی کے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا کہ انگریزی زبان میں تعلیم پانے والے ''دیسی'' چمڑی کے اعتبار سے انگریزوں سے ضرور مختلف ہوں گے لیکن وہ بولیں گے انگریزوں کی زبان اور انہی کے انداز میں سوچیں گے۔

یہ جو انگریزوں یا دیگر مغربی معاشروں کے زندہ اور بیدار افراد کی طرح سوچنے کا میکالے کا خواب تھا، یہ کم از کم ہمارے جاگیرداروں اور وڈیروں کی حد تک تو آج تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان امراء پر ان کی نسلوں کی بیمار سوچ بہت زیادہ غالب ہے جس کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ امراء اور عوام نہ ایک جیسے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے برابر۔

سو بے نظیر بھٹو بھی اپنے والدِ مرحوم کی مانند اپنی بہترین مغربی تعلیم کے باوجود اس دلدل سے نہیں نکل سکیں جو جاگیردارانہ فکر کی پیداوار ہوتی ہے۔ کانوں کی کچی تھیں، لہٰذا ان کی پارٹی کے منافق ''وفاداروں'' نے اگر میرے خلاف ان کے کانوں میں یہ زہر بھرا کہ یہ اردو بولنے والا تو ایم کیو ایم کا سفیر

ہے تو انہوں نے اس افتراء کو سچ جان لیا۔

لیکن مجھ سے باز پرس کرنے کی ایک اور قوی اور فوری وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۹۹۵ء کے شروع ہوتے ہی کرکٹ کی دنیا کے ہیرو اور پاکستان کے ایک بہت ہی مقبول بطلِ جلیل عمران خان نے اپنی سیاسی پارٹی کی داغ بیل ڈال دی تھی جس کے سبب سیاسی حلقوں میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی۔ خاص طور سے پیپلز پارٹی میں جس میں ملک کے سارے کرپٹ اور بدکردار جاگیردار پناہ لے چکے تھے۔ ان لوگوں کو عمران کی مقبولیت سے بھی ڈر لگتا تھا اور اس کے اس نعرۂ مستانہ سے بھی کہ وہ ملک میں کرپشن کا خاتمہ کر کے سماجی عدل اور انصاف پر مبنی معاشرہ تشکیل دینا چاہتا تھا۔ شاید اس لیے اس کی پارٹی کا نام تحریکِ انصاف تجویز کیا گیا تھا۔

عمران کے میدانِ سیاست میں کودنے کے ساتھ ہی حکومت نے بیوروکریسی میں خصوصاً ان افسران کی فہرستیں تیار کرنی شروع کر دیں جن پر عمران کے دوست یا ہمدرد ہونے کا گمان ہو سکتا تھا جو برسرِ اقتدار طبقہ کی نظر میں گناہ کی بات تھی۔ بھلا کسی افسر کی کیا مجال کہ وہ سرکارِ عالی کے سوا کسی اور کا وفادار یا ہمدرد ہو۔

اب یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ ہمارا نام بھی ایسے ہی لوگوں میں لیا جاتا تھا۔ اگرچہ میں ان ہمدردوں میں شامل تھا جنہوں نے عمران کو یہ مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ وہ پاکستانی سیاست کے خارزار میں قدم رکھنے کی حماقت نہ کرے۔ اس لیے کہ پاکستان کا سیاسی کلچر جھوٹوں، منافقوں اور لٹیروں کی آماجگاہ تھی جس میں ظاہر ہے کہ عمران جیسے کھرے، دیانتدار اور سچے انسان کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

پھر میرا تو سب سے بڑا جرم، حکومتِ وقت یا برسرِ اقتدار طبقہ کی نظر میں یہ تھا کہ میں نے عمران کے شوکت خانم میموریل ہسپتال کے لیے بزعمِ خود مہم چلا کر ساڑھے تین لاکھ ڈالر کی خطیر رقم فراہم کی تھی جو بے نظیر اور ان کے حواریوں کے نزدیک لائقِ گردن زدنی کام تھا۔

عمران سے میری ملاقات، شناسائی اور دوستی کی ابتداء بہت ڈرامائی طور پر اور قطعاً غیر متوقع حالات میں ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۹۲ء کے آغاز میں پاکستان کے کرکٹ ورلڈ کپ جیتنے کے دو تین ہفتے بعد کا واقعہ ہے کہ جمعہ کی دوپہر تھی اور میں نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر اپنے آرام دہ ٹی وی لاؤنج میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ بہت خوبصورت موسم تھا اور جو لوگ کویت میں رہے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہاں کھلی دھوپ میں سرما کی دوپہر کیسی گداز ہوتی ہے۔ اس عالم میں میرے پاس پی آئی اے کے جنرل منیجر خواجہ منظور الحسن کا گھبرایا ہوا فون آیا۔ خبر جو وہ مجھے دے رہے تھے، گھبرانے والی تھی اور وہ یہ کہ عمران خان کویت ایئرپورٹ پر بے یار و مددگار تھے کہ سعودی ایئر لائنز انہیں آف لوڈ کر کے ریاض کو روانہ ہو گئی تھی۔

میں نے کہا: یہ تو تشویش کی بات ہے کہ ہمارے قومی ہیرو کو جو نہ جانے کتنے لاکھوں، کروڑوں

پاکستانی دلوں کی دھڑکن تھا سعودیہ کے بدّویوں نظرانداز کر کے چلے گئے تھے۔ پھر سوچا کہ ریگ زار کے باسیوں کو ہیرے کی پرکھ بھی کہاں ہوتی ہے۔ میں نے منظور صاحب سے کہا، کہ وہ ایئرپورٹ پہنچیں اور میں خود بھی وہیں آ رہا ہوں۔

قصہ مختصر کہ عمران کے لیے تو ہم نے گلف ایئر کی اگلی پرواز سے جو دو تین گھنٹے بعد بحرین ہوتی ہوئی ریاض جا رہی تھی، سفر کا بندوبست کر دیا۔ ان کا ریاض پہنچنا بہت ضروری تھا کیونکہ اس کے اگلے روز وہاں ان کے شوکت خانم میموریل ہسپتال کے لیے، جو وہ اپنی والدہ مرحومہ کی یادگار کے طور پر بنانا چاہ رہے تھے، ایک فنڈ ریزنگ ڈنر یا عشائیہ تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے منتظم و مہتمم شوکت ترین صاحب تھے جو ان دنوں ریاض میں سٹی بینک کے لیے کام کر رہے تھے۔

عمران سے وہ پہلی ملاقات بہت طویل رہی۔ بہت باتیں ہوئیں۔ میرے بچے بھی عمران کا نام سن کر ساتھ ہو لیے تھے۔ انہوں نے ورلڈ کپ کے متعلق سوالات کا تانتا باندھ دیا اور عمران نے بہت صبر و سکون سے ہر سوال کا جواب دیا۔

عمران نے مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا کہ میں کویت میں بھی ان کے منصوبے کے لیے کچھ کروں یا نہ کروں لیکن عمران کے جانے کے بعد مجھے خود ہی خیال ہوا کہ یہ پاکستانیوں کی آنکھ کا تارا، ان کے دلوں پر راج کرنے والا اگر تن آسان ہوتا تو عقیدت و محبت کے ان لاکھوں پھولوں کے بستر پر آرام کرتا جو قوم کے بوڑھوں، جوانوں اور بچوں نے اس پر نچھاور کیے تھے لیکن یہ تو اس آرام اور چین کو تج کر کوچہ کوچہ، شہر شہر، ملک ملک مارا مارا پھر رہا ہے تاکہ اپنے خواب کو تعبیر کی قبا پہنا سکے۔ اپنی والدہ کی یاد میں، جو کینسر کے موذی مرض کا شکار ہو کر اسے یتیم کر گئی تھیں۔ ایک ایسا شفاخانہ، ایک ایسا خیراتی ہسپتال تعمیر کرنا چاہتا ہے جہاں پاکستان کے ناداروں کو اس ملعون مرض سے لڑنے کا حوصلہ اور اسباب و سامان مہیا کیا جائے گا۔

میں نے سوچا میں ایک ایسے ملک میں سفیر ہوں جہاں پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد اپنے لیے اور اپنے وطن کے لیے شبانہ روز محنت اور مزدوری سے زرِ کثیر کماتی ہے۔ اگرچہ پاکستانی اب تک عددی اعتبار سے اس سطح پر نہیں پہنچے ہیں جہاں وہ کویت پر عراقی حملے اور قبضے سے پہلے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ یہی مشن تو مجھے یہاں نواز شریف نے سونپا ہے کہ میں اپنے ہم وطنوں کے لیے کویت میں دوبارہ کثرت سے آباد ہونے کے لیے اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لاؤں۔ میں تو پلٹ کر کویت میں سفارتکاری کے حق میں نہیں تھا اور میں نے احتجاج بھی کیا تھا، جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ مجھے دوبارہ کویت میں تعینات کیا جا رہا ہے لیکن اس کے جواب میں سیکرٹری خارجہ میاں شہریار نے یہ کہہ کر حوصلہ دیا تھا کہ وزیراعظم نواز شریف کی ذاتی خواہش ہے کہ اس کٹھن وقت میں جب کویت میں

پاکستانیوں کی از سرِنو آبادکاری کا مرحلہ درپیش ہے، وہ چاہتے ہیں کہ ایسا سفیر بھیجا جائے جو وہاں پہلے رہ چکا ہو۔ جس کو وہاں کا تجربہ ہو، وہاں کے اربابِ حل وعقد سے اس کے تعلقات اور مراسم ہوں تاکہ وہ ان تعلقات کو بروئے کار لا کر اپنے ہم وطنوں کی کثرت سے کویت واپسی کی راہ ہموار کر سکے۔

میں نے طے کر لیا کہ میں از خود کویت میں عمران کے ہسپتال کے لیے فنڈز اکٹھا کرنے کی مہم چلاؤں گا۔ خواجہ منظور الحسن سے مشورہ کیا تو وہ کھل اٹھے۔ کہنے لگے: ''میں تو خود یہی چاہتا تھا لیکن آپ سے کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی''۔

ہم نے مل کر سرکردہ پاکستانیوں کی ایک کمیٹی تشکیل دی اور میں نے اس کے اراکین کو اپنے اور ان کے مشن سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے بھرپور تعاون کی اپیل کی اور ان میں سے ہر ایک نے میری آواز پر لبیک کہا۔ کمیٹی میں چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ تھے، وکیل تھے، ڈاکٹر تھے، انجینئر تھے اور ثقہ قسم کے تاجر بھی لیکن میں نے سیاسی پارٹیوں سے وابستگی رکھنے والے ''چودھریوں'' کو اس میں شامل نہیں کیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ بھی اقبال کے مُلا کی طرح سوائے فی سبیل اللہ فساد کرنے کے اور کسی کام کے نہیں تھے اور چودھریوں کے دلوں میں یہ بات تیر کی طرح ترازو ہو گئی۔

قصہ مختصر کہ میں نے کمیٹی کے بھرپور تعاون سے ہسپتال کے لیے کویت میں دو بہت بڑے پروگرام کیے جن میں سے پہلا فنڈ ریزنگ ڈنر کویت کے شیراتون ہوٹل میں جولائی کے اواخر میں عمران سے پہلی ملاقات کے چار مہینے بعد کیا اور اس میں ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ فنڈ جمع کیے۔ میں نے خود نیلام کے ذریعے عمران کے کرکٹ بیٹ اور دوسری چیزوں کو فروخت کر کے پیسہ جمع کیا۔ عمران جو نیلامی کے وقت میرے پہلو میں کھڑا تھا، اس پر حیران تھا کہ ایک سفیر اپنی سفارتکاری کے تیر کو نیلامی میں کس مشاقی سے استعمال کر رہا ہے۔

دوسرا پروگرام اس سے چند ماہ بعد اور بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ایک اور جدید ہوٹل میں کیا گیا جس کے لیے میں نے پاکستان سے اپنے پرانے ساتھی اور جامعہ کراچی کے دوست انور مقصود کو زحمت دی۔ انور پاکستان ٹی وی کے ستارے بن چکے تھے لیکن میری درخواست انہوں نے رد نہیں کی۔ انور مقصود کے علاوہ اس پروگرام کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس دور کے مقبول ترین قوال اور گلوکار نصرت فتح علی جو بین الاقوامی شہرت کے راج سنگھاسن پر فائز ہو چکے تھے اپنی پوری ٹیم کے ہمراہ تشریف لائے اور ان کی گائیکی نے سماں باندھ دیا۔ اس پروگرام کے ذریعے ہم نے ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ رقم تمام اخراجات وضع کرنے کے بعد اکٹھا کی لیکن اس دوران میں نے اپنے کویتی دوستوں اور مہربانوں کو بھی عطیات کی مہم میں شریک کر لیا تھا۔

کویت مالداروں کا ملک ہے اور میں اس کے بہت سے مالداروں کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ کویتیوں کے متعلق بہت سے حاسدوں کا یہ کہنا ہے کہ ان سے پیسہ نکلوانا جوئے شیر لانے کے برابر ہوتا ہے لیکن میرا تجربہ اس سے قطعاً برعکس ہے۔ میں عمران کے ہسپتال کے لیے جس مخیّر کویتی دوست اور شناسا کے پاس گیا اس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ عمران سے ناآشنا تھے اور وہ میری درخواست کے جواب میں پہلا سوال یہی کرتے تھے کہ یہ عمران ہے کون؟ اور پھر جب میں عمران کے مشن کی تفصیل بتاتا تھا تو وہ فوراً موم ہو جاتے تھے۔ اکثر نے تو مجھ سے کوئی سوال کیے بغیر چیک بک نکال کر ہزار ہا ڈالر کے چیک یہ کہتے ہوئے مجھے لکھ کر دے دیئے تھے کہ ہم تو تم کو جانتے ہیں۔ تم اگر کہہ رہے ہو کہ عمران نیک ہے اور نیکی کا کام کر رہا ہے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔

اس طرح میں نے اپنی ذاتی محنت اور تعلقات کے استعمال سے تقریباً ایک لاکھ ڈالر کسی اور کو بیچ میں ڈالے بغیر جمع کر لیے تھے اور یوں کل ملا کر ساڑھے تین لاکھ ڈالر سے زیادہ کی رقم میں نے عمران کو نومبر ۲۰۰۳ء میں تیسری بار کویت مدعو کر کے اپنے تمام ساتھیوں کی موجودگی میں ایک سادہ تقریب میں اپنی تمام تر دعاؤں کے ساتھ سونپ دی تھی۔

ظاہر ہے کہ عمران جیسے کھرے انسان کو میرے خلوص نے بہت متاثر کیا تھا اور اس نے دنیا بھر میں اپنے ہسپتال کے لیے ہونے والی ویسی ہی تقریبات میں، جیسی میں نے کویت میں منعقد کی تھی اکثر میں میرا خاص طور پر تذکرہ کرتے ہوئے اظہارِ تشکر کے طور پر یہ کہا تھا کہ ''میں نے ایسا سفیر اور کوئی نہیں دیکھا جس نے از خود میرے یا کسی اور کے کہے بغیر میرے ہسپتال کے لیے ایسی بھرپور مہم چلائی تھی''۔

عمران تو اپنی سادہ لوحی میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا لیکن ان چھٹ بھیوں کے دلوں پر جنہوں نے میرے خلاف میرے مخصوص لسانی تشخص کو بہانہ بنا کر پہلے ہی سے ڈاک بٹھا رکھی تھی، یہ تعریف و توصیف برچھیوں کی طرح سے لگ رہی تھی۔ سو اب انہیں میرے خلاف ایک اور ہدفِ ملامت ہاتھ آ گیا اور اسلام آباد کے لیے ان کی ڈاک میں اور اضافہ ہو گیا۔

اب یہ میرے امتحان کی گھڑی تھی کہ ادھر کویت سے میرے نام کے لعنت ملامت کے ٹوکرے جا رہے تھے اور اُدھر حکمراں جماعت میں عمران کے میدانِ سیاست میں قدم رکھنے سے کھلبلی مچ گئی تھی۔ سو میرے خلاف مقدمے کا مواد مہیا ہو گیا اور محضر تیار ہو گیا۔

کویت میں ۱۹۹۵ء کے موسمِ بہار کی پہلی کلیاں چٹک رہی تھیں کہ میرے نام سکریٹری خارجہ نجم الدین شیخ کا قیامت کا نامہ آیا۔ Top Secret سرکار میں سکیورٹی کی یہ سند بہت ہی اہم خط و کتابت میں استعمال کی جاتی ہے، لہٰذا لفافہ دیکھ کر ہی میرے لیے خط کا مضمون بھانپ لینا مشکل نہیں تھا۔

خط میں سکریٹری خارجہ نے مجھے مطلع کیا کہ میرے بارے میں وزیراعظم کو تشویش ہے اور انہوں نے مکتوب نگار کو حکم دیا ہے کہ مجھ سے دو سوالات کے جوابات بلکہ وضاحتیں طلب کریں اور دو ہفتے کے اندر اندر وزیراعظم کو میرے جواب سے مطلع کریں۔

مجھ سے جو وضاحتیں طلب کی گئی تھیں ان کے سوال یہ تھے:

۱- ''تم نے عمران خان کے ہسپتال کے لیے فنڈز کیوں جمع کیے اور کس کی اجازت سے کیے؟''

۲- ''تمہارے متعلق کویت میں رہنے والے پاکستانیوں کو یہ شکایت ہے کہ تم صرف ایک مخصوص لسانی گروہ کی سرپرستی کرتے ہو اور دیگر ہم وطنوں کو نظرانداز کرتے ہو؟''

یہ سوالات اگرچہ چونکا دینے والے تھے لیکن کویت میں پیپلز پارٹی کے مقامی کارندوں کی گزشتہ ایک طویل عرصے سے جو حرکات اور سکنات میرے علم میں آتی رہی تھیں ان کے پیش نظر یہ غیر متوقع پیش رفت نہیں تھی۔

میں نے جواب ارسال کرنے میں دو ہفتے تو کیا دو دن بھی نہیں لیے اور فی الفور مکتوب نگار سکریٹری خارجہ کو اپنا وضاحتی مکتوب اس نوٹ کے ہمراہ بھجوا دیا کہ سرکار کے مروجہ ضابطوں کے تحت میں جواب تو آپ کی وساطت سے یعنی دفتری زبان میں Through Proper Channel بھیج رہا ہوں لیکن میرا خطاب آپ سے نہیں بلکہ وزیراعظم سے ہے۔ اس لیے کہ اس خط کی تحریک ان کے ہاں سے ہی ہوئی ہے۔

میرا وہ وضاحتی خط آج بھی دفتر خارجہ کی Archives میں جہاں اہم دستاویزات اور فائل رکھے جاتے ہیں، محفوظ ہے۔ اس لیے کہ بقول میرے دوست رفعت مہدی کے جو اس وقت دفتر خارجہ میں انتظامی امور کے ایڈیشنل سکریٹری تھے، کہاں کس سفیر کی اتنی جسارت ہوتی ہے کہ وہ وقت کے حکمراں وزیراعظم کو دبنگ ہو کر ایسا بے باک خط لکھے جس میں کوئی لگی لپٹی نہ رکھی گئی ہو۔

ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اس خط کو تحریر کرنے کے دس برس بعد جب میں کینیڈا میں بس چکا تھا اور مجھے سروس سے ریٹائر ہوئے چار برس ہونے کو آ رہے تھے اور میں ۲۰۰۵ء کے نومبر، دسمبر میں دفتر خارجہ، اسلام آباد میں اپنی پنشن کے معاملات طے کروانے کے لیے گیا تو کئی ایک وہ جونیئر افسران جنہیں وہ خط پڑھنے کا موقع ملا تھا، مجھے بطورِ خاص دیکھنے اور مجھ سے ملاقات کے لیے آئے۔ یہ کہہ کر کہ ان کی بڑی آرزو تھی کہ اس سفیر کو دیکھیں جس نے ایک وزیراعظم کو ایسا کھرا کھرا خط لکھا تھا اور مجھے اس بات پر بے ساختہ حضرت حفیظ جالندھری مرحوم یاد آ گئے جنہوں نے ایسی ہی صورتحال کو ایک شعر میں یوں قلمبند کیا تھا اور کیا خوب کیا تھا:

کلام سن کے مرا مہ وشوں کی تانوں میں   بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

میں نے اپنے وضاحتی مکتوب میں پہلے سوال کے جواب میں وزیراعظم سے مؤدبانہ عرض کیا کہ اگر میں اس کا محض روایتی اور سرکاری ضابطے کے مطابق جواب دینا پسند کروں تو یہ کہنے پر ہی اکتفا کروں گا کہ آپ کو مجھ سے اس دور کے متعلق سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے جب آپ اقتدار میں نہیں تھیں اور وزارتِ عظمیٰ آپ کی تحویل میں نہیں تھی اور میں یہ عرض کردوں کہ اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف نے مجھ سے اس ضمن میں کبھی نہ سوال کیا نہ جواب طلب کیا۔

لیکن، میں نے توضیح کی، میں آپ کو اس سوال کا تفصیلی جواب دوں گا اور میرا جواب یہ ہے کہ جس الہامی کتاب پر میں ایمان رکھتا ہوں اور مجھے یقین ہے آپ بھی رکھتی ہیں، وہ مجھے یہ تلقین کرتی ہے کہ تمہارا کوئی مسلمان بھائی، کوئی مومن اگر کسی نیکی کا بیڑا اٹھائے اور تم اس کی مدد کرسکتے ہو تو مدد کرنا تم پر فرض ہے۔ میں نے عمران کے کینسر ہسپتال کے لیے جو کچھ بھی کیا وہ اسی دینی اور انسانی جذبے کے تحت کیا۔ میں نے یہ سوچا کہ میں ایک ایسے ملک میں سفیر ہوں جہاں میرے ہم وطنوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو یقیناً میری آواز پر لبیک کہے گی اور اپنے قومی ہیرو کی امداد کے لیے انکار نہیں کرے گی جس نے ملک وقوم کے لیے اتنا نام کمایا ہے لیکن اب وہ ایک جذبے اور مشن سے سرشار ہو کر دربدر پھر رہا ہے تاکہ اپنے خواب کو پورا کرسکے اور اس کا مشن بھی دکھی انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھنے کا مشن ہے۔ وہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا کینسر ہسپتال قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ وہاں ملک کے وہ غریب غرباء بھی اس موذی مرض کے خلاف علاج معالجہ کی سہولت سے فیضیاب ہوسکیں جن کا اور کوئی ولی وارث نہیں ہے۔

میں نے لکھا کہ یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ عمران نے مجھ سے فرمائش نہیں کی تھی کہ میں اس کے لیے فنڈز اور عطیات جمع کروں بلکہ از خود میں نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی اور میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ بحیثیت ایک سفارتکار میں نے آج تک جو کچھ بھی کیا ہے، اس میں میرا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے۔ مجھے اپنے اس کام پر فخر ہے اور اگر آئندہ بھی عمران یا کسی اور فرد نے اس قسم کے مشن کا پرچم بلند کیا تو میں اس کی تائید اور حمایت میں کھڑے ہونے والے سفراء میں سب سے پیش پیش رہوں گا۔

بعد میں میرے دوستوں نے مجھے بتایا کہ میرے خط کا یہ جملہ بے نظیر کو شاید سب سے زیادہ ناگوار گزرا تھا جسے انہوں نے اجاگر کرنے کے لیے اس کے نیچے بھی اپنے قلم سے لکیر پھیری تھی اور حاشیوں پر بھی لکیریں کھینچی تھیں۔

ظاہر ہے کہ بے نظیر کے جاگیردارانہ مزاج کو یہ بات کیسے گوارا ہوسکتی تھی کہ ان کا ایک ماتحت افسر نہ صرف اپنی ''غلطی'' کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا (اس لیے کہ اس کی فہم کج میں وہ غلطی غلطی تھی ہی نہیں بلکہ طرۂ امتیاز تھا) بلکہ اس کے برعکس جراُت رندانہ کے ساتھ یہ اعلان بھی کر رہا تھا کہ وہ ''اگر موقع

ملا تو'' پھر یہ حرکت کرنے سے گریز نہیں کرے گا اور اس کام میں کسی قاعدہ، قانون اور ضابطہ کو آڑے نہیں آنے دے گا۔ بے نظیر کی نگاہ میں آ بیل مجھے مار کے مصداق میں خود اپنی موت کو آواز دے رہا تھا۔

وزیر اعظم کے دوسرے سوال کا جواب میں نے قدرے تفصیل سے دیا۔ میں نے لکھا کہ مجھے بخوبی معلوم ہے کہ مجھ پر لسانی تعصب اور جانبداری کا الزام لگانے والے کون ہیں۔ ان ہی کی پارٹی کے اتھلے، پست ذہن اور تنگ نظر افراد جن کا زندگی بھر کا اصول یہ ہے کہ نہ خود کھیلیں گے نہ کسی کو کھیلنے دیں گے۔ میں نے وزیر اعظم کو ان کے ان مقامی نمائندوں کے پس منظر سے آگاہ کیا کہ یہ کس قماش اور سماجی ذہنیت کے حامل لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ جس نے اسمگلنگ کی دنیا میں آنکھ کھولی ہو اس کی ذہنی سطح کیسی ہوگی۔

میں نے اپنے اس تاسف کا اظہار کیا کہ میری پاکستان کے ساتھ غیر مشروط وفاداری پر ایسے لوگوں کی اول فول کے نتیجے میں شبہ کیا جا رہا ہے جن کو نہ پاکستان سے محبت ہے اور نہ ہی پاکستان کے فلسفۂ حیات سے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی اور ملک کی شہریت مل جانے پر اِتراتے پھرتے ہیں اور اپنے غیر ملکی پاسپورٹ دکھلا کر بے شرمی سے اکڑتے پھرتے ہیں کہ وہ نہ پاکستان کے محتاج ہیں نہ انہیں پاکستان کی ضرورت ہے۔

میں نے عرض کیا کہ مجھے پاکستان سے اپنے قلبی اور روحانی تعلق، اپنے Commitment کے لیے کسی سے سند لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں ان حادثاتی پاکستانیوں کے برعکس جو ایک رات سوئے تو وہ برطانوی سامراج کے غلام تھے اور دوسری صبح بیدار ہوئے تو ایک آزاد وطن کے شہری تھے، پاکستانیوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جس نے پاکستان کا ہونا اپنی تمام حسّیات، شعور اور ادراک کے ساتھ قبول کیا تھا اور انہیں اپنے اس غیر جذباتی اور شعوری فیصلے پر فخر تھا۔

میں نے لکھا کہ میں چھ برس کا بھی نہیں تھا جب پاکستان معرض وجود میں آیا تھا لیکن اس کچی، ناپختہ عمر کا جو نقش میرے ذہن کے کینوس پر اَن مٹ ہے، وہ یہ کہ میں اپنی آبائی پرانی دلّی کی گلیوں میں دوسرے بچوں کے ساتھ پاکستان کے حق میں نعرے لگاتا پھرتا تھا: ''بن کے رہے گا پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان'' اور ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ''۔

میرے ابّا مرحوم سرکاری ملازمت میں تھے، میری طرح ان کے لیے بھی کوئی مجبوری نہیں تھی کہ وہ اپنی سرزمین، اپنا گھر، اپنے اسلاف کی قبریں دلّی میں چھوڑ کر ایک نئے ملک کی راہ لیں۔ ان پر تو ان کے انگریز افسروں اور ہندو رفقائے کار کی طرف سے اور خاندان کے دیگر افراد کی طرف سے بھی بہت دباؤ تھا کہ وہ پاکستان نہ جائیں۔ لیکن اللہ بخشے ابّا نے پاکستان ہجرت کرنا پسند کیا۔ یہ کہہ کر کہ نئے ملک میں ان کے بچوں کا مستقبل زیادہ محفوظ اور روشن ہوگا۔

پھر میں نے وہ جملہ لکھا جو وزیر اعظم پر شاق گزرا اور ریکارڈ کے لیے انہوں نے اسے بھی لکیروں اور حاشیوں کے حصار میں باندھ لیا۔ میں نے لکھا: ''میرے باپ مطمئن ہو کر اس دنیا سے سدھارے تھے کہ ان کے بیٹوں نے اپنی محنت اور ذہانت سے اس آسمان تلے اپنے لیے جگہ بنالی تھی لیکن اب میں نہیں کہہ سکتا کہ آج عالم بالا میں وہ اپنے اس ہجرت کے فیصلے پر نازاں ہوں گے کہ ان کے ولی عہد کی نیت پر یوں جاہلوں اور شر پسندوں کی افواہوں کے نتیجے میں شبہہ کیا جارہا ہے''۔

اس خط کے تحریر کرنے کے مہینے بھر بعد میرے لیے حکومت کی طرف سے نوشتہ آیا کہ مجھے کویت سے تبدیل کر کے عراق میں سفیر متعین کیا جارہا ہے۔ ان حالات میں بغداد سے زیادہ کوئی مشکل اور صبر آزما جگہ ایک معتوب سفیر کے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔ عراق پر امریکی شہ پر اقوام متحدہ نے جو جان لیوا اقتصادی پابندیاں عاید کر رکھی تھیں ان کے ہاتھوں عراق دنیا کا سب سے بڑا بے دیوار و در کا کھلا ہوا جیل خانہ بن چکا تھا۔ بغداد کا دنیا بھر سے فضائی رابطہ منقطع تھا اور آمد و رفت کے لیے وہاں سے ایک ہزار کلومیٹر کی دوری پر عمّان، اردن کی راہ لینی ہوتی تھی۔

حکومت کویت تک جب اس پیش رفت کی اطلاع پہنچی تو وہاں کھلبلی مچ گئی۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک دشمن ملک سے کسی سفیر کو دوسرے دشمن ملک براہ راست بھجوایا جائے۔ کویت کے اس دور کے وزیر خارجہ جواب کویت کے امیر ہیں، شیخ صباح الاحمد، نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کر کے اس فیصلے پر باقاعدہ احتجاج کیا اور سخت برہمی کا اظہار کیا کہ بے نظیر جیسی وزیر اعظم نے جس نے دنیا دیکھی ہے اور جس پر یہ شبہہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اسے بین الاقوامی سفارتی نزاکتوں کا ادراک نہیں ہے، اس طرح کا غیر منطقی اور غیر دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔

شیخ صباح الاحمد نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اپنی حکومت کو ان کی برہمی سے آگاہ کرنا نہ بھولوں۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ بات سند رہے۔ میں نے ان کی تاکید پر من وعن عمل کیا جو میرا فریضہ بھی تھا۔

شیخ صباح الاحمد نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس پیش رفت پر میرا ردِ عمل کیا ہے؟ میں نے اعتراف کیا کہ میں اس فیصلے سے خوش نہیں ہوں۔ جن حالات میں مجھے کویت میں دوبارہ تعینات کیا گیا تھا، وہ بہت مشکل اور صبر آزما تھے لیکن اس کے باوجود میں نے اپنے فرائض بجالانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی اور اپنے ہم وطنوں کی کویت میں دوبارہ آبادکاری کے لیے جو میاں نواز شریف نے مجھے مشن دیا تھا، سرتوڑ اور انتھک محنت کی تھی۔

شیخ صباح الاحمد نے میری تائید کرتے ہوئے کہا کہ وہ میرے کام سے بخوبی واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ میرا اشمار کویت میں مقیم نامور سفراء میں ہوتا ہے۔

اور پھر انہوں نے مجھ سے سوال کیا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے اپنی کرسی سے آگے سرک کر مجھ سے پوچھا: ''اگر تم اس پیش رفت سے ناخوش ہو تو کیا پھر بھی تم بغداد جانا پسند کرو گے؟''

میں نے کہا: ''شیخ! پسند ناپسند کی بات نہیں ہے۔ میں ایک پیشہ ور سفارتکار ہوں اور میرے والد مرحوم نے اس دن جب میں اپنی تربیت کا آغاز کرنے کے لیے لاہور جارہا تھا مجھے ایک نصیحت کی تھی اور وہ یہ کہ میں اپنی روزی کو کبھی حرام کر کے نہ کھاؤں اور یہ بھی کہا تھا کہ دورانِ ملازمت اونچ نیچ کے مراحل آئیں گے، تمہیں وہاں بھی جانا ہوگا جہاں تم شاید پسند نہ کرو لیکن ملازمت میں دل کو مارنا بھی پڑتا ہے۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ سو میں بغداد جاؤں گا۔ یہ فیصلہ بے نظیر کا ہے لیکن میں بے نظیر کا ملازم نہیں ہوں۔ میں پاکستان کا ملازم ہوں اور پاکستان کی سربلندی کے لیے اگر مجھے پاتال میں بھی جانا پڑے گا تو میں جاؤں گا''۔

شیخ نے میری بات بہت غور سے سنی اور پھر مسکراتے ہوئے کہا: ''تمہارا جذبہ قابلِ قدر ہے لیکن پھر بھی بغداد جانا ضروری نہیں ہے''۔ میں نے عرض کیا: ''شیخ! آپ کی ستائش سر آنکھوں پر لیکن میرے پاس حکم بجالانے کے سوا اور کیا متبادل ہے۔ نوکری چھوڑ دوں گا تو کیا کروں گا؟''

شیخ نے پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا: ''متبادل ہے۔ میرے پاس ہے۔ ابوعمار تمہیں تفصیل سے آگاہ کردیں گے''۔ انہوں نے میرے ساتھ کی نشست پر بیٹھے ہوئے کویتی وزارتِ خارجہ کے انڈر سکریٹری (ہمارے سکریٹری خارجہ کے ہم رتبہ) اور میرے بہت عزیز دوست سلیمان ماجد شاہین کی طرف اشارہ کیا جو اس پوری گفتگو کو بہت غور سے سن رہے تھے۔ شاہین سلیمان کو سب ان کی کنیت ''ابوعمار'' سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ سلیمان سے میری دوستی آج بھی برقرار ہے۔ میں نے عرب دنیا میں ایک عمر گزاری ہے لیکن ابوعمار جیسا خلیق، نرم خو اور نستعلیق عرب نہیں دیکھا۔

شیخ صباح سے ملاقات ختم ہوئی تو ابوعمار مجھے اپنے دفتر میں لے گئے اور وہاں انہوں نے مجھے بتایا کہ شیخ اس پیش رفت پر اس سے کہیں زیادہ برہم ہیں جتنا اظہار انہوں نے مجھ سے ملاقات میں کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ صرف میرے ساتھ ہی زیادتی نہیں ہورہی تھی بلکہ بے نظیر بھٹو نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کویت کی بے عزتی کا ارتکاب بھی کیا تھا، ایک ایسے سفیر کو کویت سے براہ راست بغداد جانے کا حکم دے کر جسے کویتی بہت پسند کرتے تھے اور احترام کا درجہ دیتے تھے۔

پھر ابوعمار نے مجھے بتایا کہ شیخ کی یہ خواہش ہے کہ تم بغداد مت جاؤ بلکہ ایسی حکومت کی ملازمت ہی ترک کر دو جو ناقدری ہے اور اپنے سفیروں کا احترام نہیں کرتی۔ وہ مجھے کویتی وزارت خارجہ میں مشیر کا عہدہ دینے کے لیے تیار تھے۔ میری ان تمام مراعات کے ساتھ جو مجھے بطور سفیر پاکستان دستیاب تھیں۔

گھر، گاڑی، ملازم، سب کچھ اور مشاہرہ اس سے دوگنا جو پاکستان مجھے دے رہا تھا۔

میں نے جواب میں کہا: ''ابوعمار! یہ پیشکش بلاشبہ دلپذیر ہے لیکن شیخ کا میری طرف سے بہت شکریہ ادا کرنا اور بتا دینا کہ میرے لیے اب بغداد جانا ایک چیلنج ہے اور میں کسی بھی چیلنج کو قبول کرتے ہوئے نہ اس سے مرعوب ہوتا ہوں اور نہ ہی مجھے کوئی خوف ستاتا ہے''۔

میرے بغداد جانے کے احکامات مئی ۱۹۹۵ء میں آئے تھے لیکن وہاں سے میری روانگی اٹھارہ ماہ بعد ۱۱ رنومبر ۱۹۹۶ء کو ہوئی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے ایک ہفتہ قبل یعنی ۴ رنومبر ۱۹۹۶ء کو بےنظیر کی دوسری وزارتِ عظمیٰ ختم کردی گئی اور یہ کارنامہ سرانجام دینے والا کوئی اور نہیں بلکہ ان کی ہی پارٹی کے ایک رکن صدر فاروق لغاری تھے۔

میری اس کے بعد بےنظیر سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن چار برس بعد جب میں ترکی سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر کینیڈا میں آبسا تو کچھ عرصہ بعد مجھے ایک دن ای میل کے ذریعہ بےنظیر کے ایک قریبی معتمد کا پیغام موصول ہوا۔ یہ صاحب پہلے فوج میں تھے اور وہاں سے بریگیڈیئر کے منصب پر فائز ہونے کے بعد پیپلز پارٹی میں آبسے تھے اور بےنظیر کے ایک اعتبار سے پبلک ریلیشنز آفیسر کے طور پر کام کررہے تھے۔ بےنظیر تو رضا کارانہ جلاوطنی کے دور میں تھیں لیکن یہ بریگیڈیئر صاحب اسلام آباد میں پیپلز پارٹی کا سکریٹریٹ سنبھال رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بےنظیر کی جانب سے تہنیت کا پیغام بھجوایا جو میرے ''ڈان'' اخبار میں چھپنے والے ایک کالم کے حوالے سے تھا جس میں میں نے بےنظیر کی جلاوطنی پر اظہار رائے کرتے ہوئے یہ قیاس آرائی کی تھی جو پیشین گوئی کے زمرے میں آسکتی تھی کہ پاکستان میں رواں فوجی آمریت اور تسلط کے بعد جب بھی سیاسی قافلے کا رخ جمہوریت کی سمت میں مڑے گا تو بےنظیر اس میں کلیدی کردار ادا کریں گی۔ بےنظیر کو میرا تجزیہ بہت پسند آیا تھا۔

بریگیڈیئر صاحب نے مجھے بےنظیر کا ای میل کے ذریعہ خط و کتابت کا پتا بھی ارسال کیا اور مجھ کو مشورہ دیا کہ میں بی بی سے براہ راست تبادلۂ خیالات کا سلسلہ شروع کروں۔ میں نے ان کے مشورہ پر عمل کرنے میں تاخیر نہیں کی اور اس کے جواب میں بی بی نے بھی جواب دینے میں غیر معمولی بلکہ میرے لیے قطعی غیر متوقع، عجلت کا مظاہرہ کیا۔

انہوں نے میری تعریف اور توصیف میں جو کلمات رقم کیے وہ میرے لیے حیرت کا باعث تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ان کے مشیروں کا یہ کہنا تھا کہ میرا شمار دفتر خارجہ کے معدودے چند قابل اور زیرک سفیروں میں ہوتا تھا۔

دل تو چاہا کہ انہیں یاد دلاؤں کہ پانچ برس قبل ان کے مشیروں نے ان کے کان میرے خلاف کس

حد تک بھرے تھے لیکن پھر میں نے مناسب یہی سمجھا کہ ماضی کی راکھ کو نہ کریدا جائے۔ فائدہ بھی کیا تھا۔ بے نظیر سیاست کے خارزار میں جلاوطنی کے پیوند لگائے بیٹھی تھیں اور میں کینیڈا کی یخ بستہ فضاؤں میں دورانِ ملازمت کے بے شمار زخموں کو آرام دینے کے لیے ان پر برف کے پھائے رکھ رہا تھا۔

میں نے بے نظیر کو اس دورِ پرآشوب اور ان ایامِ تند و تلخ کے متعلق کبھی ایک حرف بھی تحریر نہیں کیا۔ لیکن ان سے ای میل پر تبادلۂ خیالات کا سلسلہ پابندی سے جاری رہا۔ وہ اکثر و بیشتر مجھ سے مشورہ بھی طلب کر لیا کرتی تھیں اور میں کمال دیانتداری اور غیر جانبداری کے ساتھ انہیں اپنی ناقص رائے سے نوازتا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سے زیادہ مرتبہ انہوں نے اپنی پاکستان واپسی کے موضوع پر میری رائے جاننا چاہی اور سوال کیا کہ میری نظر میں اس کے فوائد اور نقصانات کیا ہو سکتے ہیں؟ جس پر میں نے انہیں مشورہ دیا کہ ان کا وطن واپس لوٹ کر جانا میری نظر میں ایک جرأت مندانہ فیصلہ ہوگا جس سے ان کو دوررس سیاسی منفعت حاصل ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ اس امکان کو نہ مسترد کیا جا سکتا تھا نہ نظر انداز کہ وطن واپس پہنچتے ہی انہیں مختلف مقدموں میں ماخوذ ہونے کی بنیاد پر گرفتار کیا جا سکتا تھا لیکن میری دانست میں حکومتِ وقت کی یہ منتقمانہ کارروائی انہیں عوام کی نظروں میں پذیرائی اور قبولیت کی نئی اور ہمہ گیر جہتیں عطا کر دے گی۔

بے نظیر کو میرا مخلصانہ مشورہ یہی تھا کہ وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر پاکستان واپس لوٹ جائیں کہ فوجی آمریت اپنے تمام تر دعوؤں کے باوجود ان کی اس جرأت رندانہ کے جواب میں کوئی مضبوط حصار پیدا کرنے سے معذور تھی۔

بے نظیر نے میرے مشورہ پر اس وقت عمل نہیں کیا۔ یقیناً ان کی کچھ مجبوریاں رہی ہوں گی، کچھ تحفظات ہوں گے لیکن انہوں نے مجھے میری مشکلات میں بلاشبہ بہت ہی صائب مشورہ سے نوازا جو میرے کام آیا اور آج تک آ رہا ہے۔ دفتر خارجہ پر ان دنوں جن خوارج کا قبضہ تھا، وہ مجھے ہر طرح سے پریشان کرنے اور نقصان پہنچانے کے درپے تھے۔ مجھے انقرہ سے دور کرنے کے عمل میں انہوں نے جو گھٹیا اور رکیک حرکتیں کی تھیں ان کا کڑوا مزہ نہ صرف میرے منہ میں اس وقت تک باقی تھا بلکہ ترکی کی میزبان حکومت کو بھی ان کے ہاتھوں ایک انتہائی عجیب و غریب اور ناگوار تجربہ ہو چکا تھا۔

میں ان خارجی بونوں اور چھٹ بھیوں کی ریشہ دوانیوں (جن کی ایک الگ اور طویل داستان ہے جس کا یہاں تفصیل سے تذکرہ کرنے کا محل نہیں) سے اتنا عاجز اور تنگ آ چکا تھا کہ ایک دن تو میں نے جنرل مشرف کے نام استعفیٰ کا خط بھی تحریر کر لیا تھا، البتہ اسے بھیجا نہیں تھا۔ سوچا کہ کیوں نہ بے نظیر سے بھی مشورہ کر لوں۔ میں نے اپنا درِ دل سب ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا جس کے جواب میں بے نظیر نے مجھے انتہائی عجلت سے جواب میں تاکید کی کہ میں استعفیٰ دینے کی حماقت نہ کروں کہ اس طرح میں

اپنی پنشن سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔

مجھے خوشی ہے کہ بے نظیر نے نہ صرف مجھے صائب مشورہ دے کر اس حماقت سے باز رکھا بلکہ خوارج سے لڑنے اور اپنے حق کے لیے جدوجہد کرنے کا حوصلہ بھی عطا کیا۔ میں جنوری ۲۰۰۲ء میں ساٹھ برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد اپنی ملازمت سے عزت وآبرو کے ساتھ اعلیٰ ترین گریڈ (22) میں ریٹائر ہوا لیکن پنشن کے معاملات کی الجھی ہوئی ڈور سلجھانے میں مزید چار برس لگے اور اللہ اللہ کر کے ۲۰۰۶ء کے آغاز سے مجھے پنشن ملنی شروع ہوئی۔ بلاشبہ بے نظیر کے صحیح مشورہ نے میرے لیے اس منزل تک پہنچنے کی راہ ہموار کی تھی۔

بے نظیر کے ساتھ ای میل پر تبادلۂ خیالات اور مشاورت کا سلسلہ ایک طویل مدت تک جاری رہا۔ وہ اپنی جلاوطنی کے ایام میں بارہا امریکہ یاترا پر بھی آئیں۔ ایک دو بار تو میں نے ان سے پوچھا کہ میں واشنگٹن یا نیویارک میں ان سے ملنے کے لئے آنا چاہوں تو انہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ اور جواب میں انہوں نے کہا کہ شوق سے آؤ۔ تم سے مل کر مجھے خوشی ہوگی لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی مجبوری یا مصروفیت آڑے آ گئی اور میں ان سے ملنے امریکہ نہیں جاسکا۔

میں نے اس دوران یہ محسوس کیا اور یہ احساس کوئی میرے ذہن کی اختراع نہیں تھی کہ وہ امریکہ سے اپنی وطن واپسی کے لیے آشیرواد حاصل کرنے کے لیے بہت سنجیدگی سے کوشاں تھیں۔ اگرچہ یہ تلخ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ تھی کہ 9/11 کے سانحہ کے بعد بش انتظامیہ نے جنرل مشرف کے ساتھ جو بندھن باندھا تھا اور جس انداز میں واشنگٹن اور اسلام آباد میں افغانستان کے خلاف لشکر کشی کے معاملہ میں پینگیں بڑھ رہی تھیں اس کے بعد بے نظیر کی افادیت طوطا چشم بش انتظامیہ کی نظر میں صفر کے برابر ہو چکی تھی۔ عالم یہ تھا کہ بے نظیر کو واشنگٹن میں معمولی درجے اور حیثیت کے سرکاری عمّال سے وقت لینے کے لیے تگ ودو کرنے کی نوبت آ چکی تھی لیکن بی بی نے ہمت نہیں ہاری اور آخر کار بش اور ان کے انتہا درجے کے قدامت پسند مشیروں کو اپنی افادیت کے ضمن میں قائل کر کے ہی چھوڑا...... یہ الگ بات ہے کہ طویل جلاوطنی کے بعد وطن واپسی انہیں راس نہیں آئی۔

میں اس منحوس شام کو کراچی ہی میں تھا جب بے نظیر کی زندگی کا چراغ ایک قاتل یا قاتلوں کے ہاتھوں راولپنڈی کے خونی لیاقت باغ کے سامنے گُل کر دیا گیا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے ٹی وی کے پردہ پر وہ مناظر دیکھ رہا تھا۔ جن میں عقل وخرد سے بے بہرہ سرکاری کارندے پاکستان کی سب سے معروف اور مقبول سیاستدان کے اندوہناک قتل کے آدھے گھنٹے بعد پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ موقع واردات کو یوں تیز دھار پانی سے دھو رہے تھے جیسے قربانی کے بکرے کو ذبح کرنے کے بعد قربانی

کی جگہ سے خون صاف کیا جاتا ہے۔
بے نظیر کے خونِ ناحق کے چھینٹے کس کس کے دامن پر ہیں اس کا فیصلہ ممکن ہے ہماری زندگیوں میں نہ ہو۔ پاکستان میں ہونے والے سیاسی قتل پہلے شہید قائد ملت لیاقت علی خاں سے لے کر بے نظیر تک، مصلحتوں اور سازشوں کے بوجھ تلے دب کر دم توڑتے آئے ہیں۔ لہٰذا کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی، اگر بے نظیر کے قتل پر بھی پردہ پڑا رہا۔ اور سازشی یہی تو چاہتے بھی ہیں۔
لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بے نظیر کو قتل کرنے والوں نے ان کی جان لینے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں صحت مند جمہوریت کے فروغ کے امکانات کو بھی زندہ درگور کرنے کا سامان کیا ہے۔
بے نظیر کو جلاوطنی کے طویل برسوں اور تلخ و ترش تجربات نے بہت کچھ سکھایا تھا۔ ان سے میرا جو سلسلۂ مشاورت تھا اس نے مجھے یہ سبق دیا تھا کہ جلاوطنی نے بے نظیر کی نخوت کے پندار کو پاش پاش کر کے اس سمجھدار اور زیرک سیاستدان کو رہا کر دیا تھا جس کا سر ماضی کی طرح بادلوں میں گھرا ہوا نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس اس کے قدم اب زمین پر تھے اور پاکستان کی دکھیاری اور سسکتی، بلکتی دھرتی کے دکھوں کا ادراک اور شعور اب ان قدموں سے گیلی مٹی کی طرح سے چپک گیا تھا۔
بے نظیر کو اگر موت نے مہلت دی ہوتی تو پاکستان کا وہ حال نہ ہوتا تو جوان کے شوہر نامدار کے ہاتھوں ہوا ہے۔ بے نظیر کے پاس اپنے باپ کی ویسی کوئی وصیت نہیں تھی جس طرح کا وصیت نامہ آصف علی زرداری نے ان کی موت کے چند گھنٹوں بعد ہی دنیا کے سامنے پیش کر دیا لیکن بے نظیر کو ورثے میں ذوالفقار علی بھٹو کی بصیرت ملی تھی اور بصیرت کاغذ کے پرزوں پر لکھی ہوئی وصیت سے کبھی منتقل نہیں ہوتی۔